معاصر ادب اور ادیب

شفیع ہمدم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معاصر ادب اور ادیب

شفیع ہمدم

مقبول اکیڈمی
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

انتساب

محترم الوقار ملک مقبول احمد صاحب

کے

نام

جو ناشر میں سے ادیب بن کر ابھرے

ترتیب

مجید امجد کی نثر

اُردو نظم میں مجید امجد کا شمار صفِ اول کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ دوسرے شعرا کی نسبت ان کے یہاں زیادہ تنوع، رنگارنگی اور شعریت پائی جاتی ہے۔ انہوں نے جس مہارت اور سلیقے سے لفظوں کو اپنی نظم کی شال میں ٹانکا ہے۔ اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ وہ ساتویں جماعت سے شعر کہنے لگے تھے۔ ان کا زیادہ رجحان نظم کی طرف تھا۔ اس لئے غزل اور نثر کی طرف کم توجہ دے پائے۔ چنانچہ ان کی نظموں پر تو بکثرت مضامین لکھے گئے مگر غزل کی طرف کم توجہ دی گئی اور نظم کی طرف تو بہت ہی کم دھیان دیا گیا۔

مجید امجد ہفت روزہ ''عروج'' جھنگ کے ایڈیٹر بھی رہے۔ انہوں نے دیباچے اور پیش لفظ بھی رقم کئے۔ اداریے بھی لکھے، تراجم بھی کیے، فکاہی کالم اور خطوط بھی تحریر کیے۔ اگرچہ انہوں نے نثر زیادہ نہیں لکھی مگر ان کی نثر میں جو حسن، دلآویزی اور کشش ہے وہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ ان کی شاعری کی طرح نثر بھی اپنے منفرد لہجے کی وجہ سے فوراً پہچانی جاتی ہے۔ مجید امجد کی نثر سے بھی ہم اپنے ذوق اور فنی ارتفاع کی تربیت کرتے ہیں۔ ان کی نثر غیر مانوس الفاظ اور نوتراشیدہ تراکیب کے پردوں میں مخفی نہیں ہوتی کہ ابلاغ کا مسئلہ کھڑا ہو جائے۔ وہ سادہ، سلیس اور رواں زبان میں اپنے خیالات کا اظہار مؤثر اور دِلنشین انداز میں کرتے ہیں کہ نثر میں بھی نظم کا سا لطف آتا ہے۔ شیر افضل جعفری کے شعری مجموعے ''سانولے من بھانولے''

کے حرفِ اول میں اپنے خیالات کا اظہار کتنی عمدگی سے کیا ہے۔

''ہم جب ان کی نرم و گداز نظموں کو جن کے جسم پر غزل کا شبنمیں پیراہن ہے اور لطیف و جمیل غزلوں کو جن کی روح کے اندر ایک سرشار نظمیت لڑکھڑا رہی ہے۔ پڑھتے ہیں تو کبھی یوں محسوس کرتے ہیں گویا کسی نے ہمارے ارضی رِشتے کاٹ دیئے ہیں اور ہم کسی ان بوجھی کسک کے تحت کھوئے کھوئے سے ان منزلوں کی طرف رواں ہیں جہاں شعلوں کی وادیوں میں وفاؤں کے گلزار مہک رہے ہیں۔''

مجید امجد کی نثر نغمیت، نظمیت اور لطافت سے لبریز ہوتی ہے۔ جس کی قرأت سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی عمدہ نظم پارے کا مطالعہ کر رہے ہوں۔ وہ لفظوں کی عظمت، حرمت اور منزلت سے بخوبی واقف تھے انہیں استعمال کرنے کا ہنر بھی جانتے تھے۔ وہ بخوبی واقف تھے کہ ہر لفظ کے اندر ایک جادو ہوتا ہے، جب تخلیق کار اس لفظ کو مہارت سے استعمال کرتا ہے تو اس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ مجید امجد نے ڈاکٹر وزیر آغا کی نظموں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کفایت لفظی کا استعمال اتنی عمدگی سے کیا ہے کہ ایک طویل مضمون کو چند سطور میں مقید کر دیا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس میں لطافت بھی ہے نزاکت بھی، طرفگی بھی اور فصاحت بھی۔

''ان نظموں میں بات کہیں گہری کہیں گمبھیر، کہیں چنچل ہے، اس کی لانبی زلفیں سونے کے باریک مہین تاروں کی طرح لہراتی ہیں۔ آپس میں اُلجھتی ہیں۔ موضوع نازک ہیں ادق نہیں۔ اشارے بلیغ ہیں مبہم نہیں۔ علامتیں فکر اندوز ہیں ژولیدہ نہیں۔ کہیں بھی تصنع اور کاوش کا نشان نہیں ملتا۔ کہین بھی کوئی شعوری اُلجھن کوئی بناوٹی خیال آرائی قاری کو نہیں کھٹکتی۔ کسی بات پر کسی بلند

بانگ فلسفے کی چھاپ نہیں۔"

الفاظ نگینوں کی مانند ہوتے ہیں۔ ایک اچھا تخلیق کار اپنی زبان کی شال پر دوسری زبان کے نگینوں (الفاظ) کو اتنی مہارت سے ٹانکتا ہے کہ شال کی شان بھی بڑھ جاتی ہے اور نگینوں کی قیمت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ مجید امجد اُردو زبان میں پنجابی کے الفاظ کے استعمال کو معیوب خیال نہیں کرتے تھے۔ وہ اُردو اور پنجابی کو دو ایسے قالب سمجھتے تھے جو ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔

"الفاظ پنجابی کے ہوں یا اُردو کے دونوں مقدس ہیں۔ شیر افضل جعفری نے اپنی شاعری میں پنجابی کے الفاظ اتنی کثرت سے استعمال کیے ہیں کہ پنجابی لفظوں کا یہ استعمال ان کی پہچان بن گیا ہے۔"

وہ شیر افضل جعفری کے شعری مجموعہ "سانولے من بھانولے" کے حرفِ اول میں پنجابی کے استعمال کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اگر راوی چناب کے علاقوں کے وہ لفظ جنہیں وہاں کے لاکھوں انسان اپنی روزمرہ کی بول چال میں استعمال کرتے ہیں شیر افضل جعفری کے شعروں میں آگئے ہیں تو انہیں غیر مانوس نہیں کہا جا سکتا ایک تو ان بولیوں کے الفاظ کا تاریخی رشتہ مسلم ہے۔ دوسری طرف ان الفاظ کا اس روایت کے ساتھ گہرا تعلق ہے جو ان اشعار میں مضمر اور منعکس ہیں۔"

بعض شعری مجموعوں کے دیباچے رقم کرتے ہوئے مجید امجد نے اگرچہ تفصیل سے گریز کیا ہے لیکن اختصار میں بھی نقد کا معیار برقرار رکھا ہے۔ وہ شاعر کی شعری معنویت کے اُس جوہر تک رسائی کی کوشش کرتے تھے، جو اُس کی تخلیقی قوت اور تاثیر کا باعث ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں منیر نیازی کے مجموعۂ کلام "جنگل میں دھنک" کے

دیباچے سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"۔۔۔خیال اور جذبے کی اَن دیکھی دُنیاؤں کے پرتو فطرت کے رنگوں اور خوشبوؤں میں تحلیل ہوتی، تیرتی بدلیوں کے سایوں میں روتے دِلوں کی کروٹ جو اس کے شعروں اور شبدوں میں مجسم اور جاوید ہو کر رہ گئی ہے۔اُردو نظم کے مرحلہ ہائے ارتقا کی ایک جاندار کڑی ہے۔"

مجید امجد کے بارے میں یہ خیال عام ہے کہ وہ سنجیدہ، متین، افسردہ، مردم بیزار اور خلوت نشین انسان تھے مگر یہ درست نہیں ہے۔انہوں نے شاعری میں کہیں بھی مریضانہ مایوسی اور کم ہمتی کا مظاہرہ نہیں کیا۔وہ دوستوں کے ساتھ ہوٹلوں میں بھی وقت گزارتے تھے۔خطوط کا جواب بھی بڑی باقاعدگی سے دیتے تھے۔خطوط اور فکاہی کالموں میں پھلجھڑیاں بھی چھوڑتے تھے۔ان کے خطوط اور کالموں میں شگفتگی بھی ہے۔لطافت بھی، طنز بھی ہے اور ظرافت بھی۔وہ ایک خط میں کبیر انور جعفری کو لکھتے ہیں:

"اب آپ خدارا اس سوانگ کو ختم کیجئے۔ٹھیک ہے آپ بیمار تھے۔اچھا ہوا اب آپ اچھے ہیں۔انسان کی عظمت بیماری میں نہیں صحت میں ہے۔ بلا تاخیر مزید کے تندرست ہو جائیے اور اپنے تازہ افکار سے نوازیئے۔آپ کا فارسی کلام نظر سے گزرا۔باقی اشعار عرفی اور نظیری کے لہجے کو بھی مات کر رہے ہیں۔البتہ ایک جگہ سرگستاں (بمعنی سرپھرے) آپ نے باندھا ہے۔اس کی کوئی سند؟ اب آپ غزل طبرانی یا فرانسیسی زبان میں بھی کہیں کم از کم چینی زبان میں ہی سہی۔"

کبیر انور جعفری کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں، جس میں ان کا مزاح اور جعفری صاحب کی معصومیت باہم آمیز ہو کر خوب مزا دیتی ہے:

''رہ گیا معاملہ آپ کی غزل کے انگریزی ترجمے کا اس کے بارے میں آپ براہِ راست ایڈیٹر صاحب سے بات کریں۔ کیسے کیسے خیالی پلاؤ آپ بھی وہاں بیٹھے پکا رہے ہیں۔ انگریزی ایڈیشن ضلع منٹگمری کے ترقیاتی منصوبوں کے بارے میں اور اس میں طبع ہوئی عہد انحطاط اسلام کی ایک یادگار صنف غزل اور وہ بھی آپ کی۔''

مجید امجد فکاہی کالم ''اشارات'' میں ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''حقوں کی پوری شان وشوکت صرف پنجابی زمینداروں کے ڈیروں پر نظر آسکتی ہے۔ اور پنجاب کے ٹاٹ سکولوں میں حقے رکھ دیئے جائیں تو نہ صرف زمیندار ہی کھچے چلے آئیں گے بلکہ ان کے ساتھ ان کے خادم بھی چلے آئیں گے جو ڈیروں پر چلموں میں آگ بھرتے ہیں۔ اُپلوں کی دھونی کو سلگاتے ہیں۔ حقے میں پانی ڈالتے ہیں اور حقے کا پیچوان پکڑ کر بیٹھتے ہیں اور باری باری ہر آدمی کے پاس اس کو گھماتے رہتے ہیں۔ انسانی مساوات کی سچی مثال اگر کہیں نظر آسکتی ہے تو زمیندار کے ڈیرے پر نظر آسکتی ہے۔ جہاں ہزاروں مربعوں کا مالک نواب اور ٹکے کا مراثی ایک ہی حقے کو منہ لگا کر پیتے ہیں۔''

مردم بیزار اور زندگی سے اُکتایا ہوا شخص ایسے شگفتہ خطوط اور فکاہیہ کالم کیسے لکھ سکتا ہے۔ ایسی شاداب تحریر لکھنے والا زندگی سے پیار بھی کرتا ہے اور اسے ہر حال میں گزارنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ مجید امجد نے زندگی کو تمام تر تکالیف کے ساتھ قبول کیا اور نہایت پامردی، خوش دِلی اور خودداری سے بسر بھی کی۔ 1973ء کے سیلاب پر صفدر سلیم سیال کی ایک نظم ''ہمارا گاؤں ہمارے بچے'' جو ''فنون'' میں چھپی تھی۔ مجید امجد کو وہ نظم پسند آئی۔ انہوں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار تحریر کردہ ایک خط میں کیا تھا۔ اس خط کو

صفدر سلیم سیال اپنی ادبی زندگی کا قیمتی سرمایہ سمجھتے ہیں۔ خط اگر چہ مختصر ہے مگر مجید امجد کے جملوں میں جو جامعیت اور کاملیت ہے وہ کفایت لفظی کی بہترین مثال ہے۔ خط ملاحظہ کیجیے:

''آپ کی نظم ۔۔۔ سیلاب کے بارے میں فنون میں پڑھی۔ نظم بے حد پسند آئی۔ بڑی لاجواب، بے مثال اور لازوال نظم ہے۔ جس کی نازک آبگوں مواج سطروں کو وقت کا کوئی سیلاب منہدم نہیں کر سکے گا۔ آپ آج کل کہاں ہیں۔ جھنگ میں، احمد پور کہ ملتان میں، میں تو یہاں پڑا ہوا ہوں۔ مجید امجد''

مجید امجد جو 1914ء میں جھنگ میں پیدا ہوئے۔ عمر کا بیشتر حصہ ساہیوال میں گزارا 1974ء میں جھنگ میں پیوند خاک ہوئے۔ انہیں جھنگ کے دیہاتوں، کھیتوں کھلیانوں، ٹیلوں، بانسری کی مدھر آوازوں، پنگھٹ پر پنہاریوں کے جھرمٹوں، چلتے ہوئے کنوؤں، بہتے ہوئے پانیوں، ہیروں، رانجھوں، جیالے گھبروؤں، متوالے چرواہوں غرضیکہ جھنگ کا ذرہ ذرہ بہت عزیز تھا۔ انہوں نے کبیر انور جعفری کے شعری مجموعہ ''لب سرخ'' پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے جھنگ سے اپنی قلبی وابستگی اور اٹوٹ محبت کا ذکر اتنے مؤثر انداز میں کیا ہے کہ اس کی قرأت سے قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خود اپنی آنکھوں سے اس علاقے کو دیکھ رہا ہو۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں انہوں نے کبیر انور جعفری کی شاعری کے حوالے سے جھنگ کی منظر کشی کی ہے:

''جھنگ دیس کے دیہات، ان کی رنگینیاں، ان کی روندی ہوئی تلخیاں، ہنستی ہوئی رونقیں، ان کے مناظر ان کے باسیوں کے دُکھڑے، تھل ریگ زاروں کے ٹیلوں کی ات جوانیاں اور شاداب سبزہ زاروں میں پھیلی ہوئی اُداس نزہتیں، بچھڑے دلوں کی دھڑکنیں، بانسریوں کی دلگداز موسیقیاں، کھیت،

پنگھٹ، قافلے، جادے، گیت غرضیکہ ایک خطہ ارضی کے سارے ہنگامے ان کے شعروں کے اندر جیتی جاگتی تصویریں بن کر زندہ ہیں۔ یہ سب ان کے قلم کا اعجاز ہے اور یہ معجزہ کاری ان کی عمر بھر کی مشق، محنت اور ریاضت کا نتیجہ ہے۔''

مجید امجد نے جس بھی تخلیق کار میں جوہرِ تخلیق کی آب کو محسوس کیا، اُسے منفرد الفاظ میں سراہا۔ فی زمانہ جب کہ کتابوں کے دیباچوں اور مضامین کے پس منظر میں کئی معاشرتی عوامل بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ مجید امجد نے بعض ایسے شعراء پر بھی اپنے تنقیدی خیالات رقم کیے ہیں جو زیادہ تر گوشہ نشین رہے یا اُن کی شہرت اخباری شعراء کی نسبت نہایت کم ہے مراتب اختر کا نام صرف سنجیدہ اہلِ قلم جانتے ہیں۔ مراتب اُن شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ جعفری نے ۶۰ کی دہائی میں ادب کے سنجیدہ حلقوں میں اپنا معیار منوالیا تھا۔ مجید امجد اُن کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اِن اشعار پر مکاشفوں کا گمان ہوتا ہے۔ اپنے تاثر پر اپنا اعتقاد، اپنے اعتقاد پر اپنا ایمان، اپنے اسی اطمینان کا وقار، ان کے ہر شعر سے جھلکتا ہے۔ جا بجا ایک ضبط ہے۔ جس کی اپنی تمکنت ہے۔ ایک شگفتگی ہے، جس کا اپنا جلال ہے۔ ایک کربِ مہجوری ہے، جس میں گراوٹ نہیں متانت ہے۔ ایسا احساس ہوتا ہے جیسے محبوب کے ساتھ بات کرتے وقت شاعر کے لہجے میں محبوب کا اندازِ رضامندی اس میں شامل ہوگیا ہے...... جہاں خارجی اشیاء کا بیان ہے، وہاں یوں لگتا ہے جیسے یہ اشیاء اپنا ٹھوس وجود رکھتے ہوئے بھی بے جسم ہیں اور شاعر کے شعور کا حصہ ہیں جسم کے باہر جس قدر موجودات ہیں ان کی حقیقت و ماہیت خود شاعر ہی کے احساس کا پیکر ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ ساری دُنیا اس کی رُوح کا لباس ہے۔''

مجید امجد اپنے ایک تنقیدی مضمون ''کیا موجودہ ادب رو بہ زوال ہے؟''
میں 1959ء میں لکھی جانے والی غزل کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے
ہیں کہ مشاہدے اور تجربے سے اپنے جذبات کی دھڑکن کو الفاظ کا خوبصورت پیرہن
پہنانا غزل کی اساس ہے۔ بعض لوگ جن کے پاس کہنے کو کوئی بات نہیں ہوتی۔ وہ لفظوں
کی بازیگری سے لوگوں کو حیران تو کر سکتے ہیں متاثر نہیں۔ ان کا کلام اس شعریت سے
محروم ہوتا ہے جو جذبے کی دھڑکن سے پیدا ہوتی ہے اور یہی جذبہ غزل کی جان ہے۔''
انہوں نے چند سطور میں اصل غزل گو شعراء کی اتنی عمدگی سے نشان دہی کی ہے کہ ادب کا
عام سا قاری بھی ان کی بات آسانی سے سمجھ جاتا ہے۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے پاس کہنے کی کوئی بات نہیں لیکن
اچھوتی زمینوں کے ردیف وقوافی کے خمیر سے اور نوتراشیدہ تراکیب اور غیر
مانوس الفاظ کے پردے میں وہ ایک ایسا طلسم اظہار بپا کر لیتے ہیں جو قاری
کو ایک حیران کن دُنیا میں لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ اس دُنیا کے اندر ہر صنعت
گری اور رنگینی ہوتی ہے لیکن جذبے کی دھڑکن نہیں۔''

مجید امجد نے اشرف قدسی کے شعری مجموعہ کا پیش لفظ تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے
کہ ''تقسیم ملک کے وقت اشرف قدسی کی عمر دس برس تھی۔ وہ خاک اور خون کے سمندر کو
عبور کرتا ہوا پاکستان پہنچا۔ غربت کے تھپیڑے کھاتا ہوا پاکستان کے مختلف ادوار کے
طوفانوں میں بہتا رہا۔ جب وہ ان واقعات کو سرزمین وطن کے حوالے سے نظم کرتا ہے تو
اس کی یہ طویل نظم سراپا دردوسوز میں ڈھل جاتی ہے اور بے چشم نم اس کی قرأت کرنا
دُشوار ہو جاتا ہے۔ اس مضمون میں ان کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''یہ اشرف قدسی کی پہلی کاوش ہے، یہ کوئی قصۂ رنگ و بو نہیں۔ اسے

بیان کرنے کے لیے پھولوں کی سیج درکار نہیں۔ یہ کہانی ایک قوم کے پُر آشوب عہد کی حکایت ہے۔ وہ اشک خون میں لتھڑی ہوئی پلکوں سے لکھی جاتی ہے۔"

مجید امجد نے نثر میں بھی اپنے خیالات اور جذبات کو اتنی خوبصورتی سے لفظوں کے بندھن میں باندھا ہے کہ لفظ اور خیال سے پھوٹنے والی روشنی سے دِل و دماغ اور فکر و نظر منور ہو جاتے ہیں انہوں نے اپنے دوستوں اور اقربا کو خاصی تعداد میں خطوط تحریر کیے تھے۔ (صرف کبیر انور جعفری کو تحریر کردہ خطوط کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہے۔ جو اس وقت ان کے صاحبزادے ظفر احمد پوری کی تحویل میں ہیں) انہیں اکٹھا کر کے شائع کرنے کا بندوبست ہوا تو ان کی نثر پر جمی ہوئی وقت کی گرد خود بخود ہٹ جائے گی اور بطور نثر نگار بھی وہ کھل کر سامنے آ جائیں گے۔

............☆☆............

وزیر آغا بطورِ خاکہ نگار

وزیر آغا' اُردو ادب کی بڑی شخصیت اور مختلف جہات کے مالک تھے۔ اُن کی کتاب ''شامِ دوستاں آباد' کے شخصی مضامین پر نظر ڈالتا ہوں تو اُن کی ایک اہم جہت اُبھر کر میرے سامنے آجاتی ہے۔ ان مضامین میں ایک خاکہ نگار چھپا بیٹھا ہے۔ جس طرح ایک مصور، لکیروں کے ذریعے، کسی شخص کے چہرے کے نقوش نمایاں کرتا ہے، اسی طرح خاکہ نگار لفظوں کے ذریعے شخصیت کے خدوخال اُبھارتا ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں پوری شخصیت کو نمایاں کر دیتا ہے۔ وزیر آغا نے ان مضامین میں جن شخصیات کا ذکر کیا ہے، اُن کے مختصر مختصر اقتباسات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وزیر آغا کے اندر کتنا بڑا خاکہ نگار چھپا بیٹھا ہے اگرچہ انہوں نے ان مضامین کو کبھی ''خاکے'' نہیں کہا!

''شامِ دوستاں آباد' مین اُنہوں نے ''نانا جان'' پر جو مضمون تحریر کیا ہے، وہ بھی کسی خاکے سے کم نہیں۔ یہ ''نانا جان'' اُن کے حقیقی نانا نہیں تھے، دور پار کے رشتے دار تھے جن کی زندگی کا بیشتر حصہ لاہور میں بسر ہوا مگر عمر کے آخری دنوں میں وہ گاؤں میں آباد ہو گئے تھے۔ اُنہیں گاؤں کے سب چھوٹے بڑے ''نانا جان'' کہہ کر پکارتے تھے۔ دیکھیے، اُن کے سراپے کا نقشہ کتنی خوبصورتی سے کھینچا گیا ہے:

''نانا جان'' کی عمر کوئی اسی برس کے لگ بھگ ہوگی۔ لمبا قد، سفید رنگ، تیز آنکھیں اور آنکھوں کے نیچے اُبھرے ہوئے گوشت کے حلقے! میں

اُن کے قد کو بجلی کے کھمبے سے تشبیہ دیتا لیکن بجلی کا کھمبا بہت سیدھا ہوتا ہے اور نانا جان اُوپر سے جا کر کچھ جھکے ہوئے تھے۔ ہاں اگر کسی ایسے کھمبے کا تصور کیا جائے جو بادوباراں کے طوفان کے بعد اُوپر سے خم کھا گیا ہو تو شاید تشبیہ میں حقیقت کا رنگ جھلکنے لگے۔"

اس مضمون میں وزیر آغا ایک جگہ، نانا جان کی بے حسی، بے مروتی اور لوگوں سے بے تعلقی کے بارے میں لکھتے ہیں:

ایک طویل تنہائی اور بے تعلقی نے اُن کے جذبات کے سارے سوتے خشک کردیے تھے۔ اب وہ زندگی کے لق ودق صحرا میں ابوالہول کا ایک ایسا مجسمہ بن کر رہ گئے تھے جس پر سے بیسیوں طوفانوں کا خروش برس کر گزر جاتا اور وہ اسی طرح ساکت و جامد رہتا ہے۔" (ص ۱۸)

اس ضمن میں وزیر آغا نے دو مثالیں بھی دی ہیں۔ پہلے نانا جان کی والدہ اور پانچ برس کے بعد اُن کی بیوی دیارِ غیر میں تنہائی کی موت مرگئی تھی:

"نانا جان! آپ کی والدہ...... میں ایک لحظے کے لیے رک گیا...... آپ کی والدہ فوت ہوگئیں۔ نانا جان کچھ دیر خاموشی سے بیٹھے حقے کے تیز تیز کش لیتے رہے اور پھر انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا...... برخوردار سب کو مرجانا ہے...... جاؤ آرام کرو!...... اپنی بیوی کی جاں سوز موت کا بھی اُن کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا کہ وہ حقے کے دو ایک تیز تیز کش ہی لے لیتے...... سب کو مرجانا ہے...... برخوردار اور بس!" (ص ۱۸)

بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے سینے میں دل کے بجائے پتھر کا ایک ٹکڑا رکھا ہوا تھا جس پر بڑے سے بڑے المناک حادثے کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا مگر ایسا ہرگز نہ

تھا۔یکا یک اُنہیں رابعہ کے کتے سے پیار ہوگیا۔وہ شخص جو بھکاریوں کو اُن کا پیچھا کرتے ہوئے گاؤں سے باہر نکال آتا تھا اور کتوں سے شدید نفرت کرتا تھا رابعہ کے کتے سے اس کے پیار نے گاؤں والوں کو حیرت میں ڈال دیا۔خوبصورت رابعہ، گاؤں میں نووارد تھی۔ وہ دو ماہ قبل دُلہن بن کر اس گاؤں میں آئی تھی اور اپنے ساتھ ایک کتا بھی لائی تھی۔وہ کھیتوں میں اپنے خاوند کو دوپہر کا کھانا دینے جاتی تو نانا جان اُس کے پیچھے جاتے تھے۔کتا کبھی اُن کے پاس اور کبھی رابعہ کے پاس جاتا رہتا۔رابعہ پہلے تو گھبرائی مگر نانا جان کی عمر دیکھ کر اُسے کوئی شک نہ گزرا۔ایک روز رابعہ اچانک فوت ہوگئی مگر نانا جان پر اُس کی موت کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔البتہ بھنگ کی مقدار میں اضافہ ہوگیا اور حقے سے لگاؤ بھی کچھ بڑھ گیا تھا۔وزیر آغا لکھتے ہیں:۔

''میں چھڑی کو ہوا میں گھماتا اور ہولے ہولے سیٹی بجاتا، اُس جھنڈ کے قریب سے گزرا تو رُک گیا۔دبی دبی سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔ ایسے دلفریب موسم میں کون خستہ جاں تھا جو اس دردانگیز سوز سے رو رہا تھا! میں ہولے ہولے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوگیا اور ایک خاردار جھاڑی کے قریب پہنچتے پہنچتے یکا یک ٹھٹھک کر کھڑا ہوگیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرا دل اپنے ہاتھ میں لے کر مسل دیا ہے۔سامنے نانا جان زمین پر بیٹھے تھے۔موتی کو اُنہوں نے بڑے زور سے اپنے سینے کیساتھ چمٹا رکھا تھا اور اُن کے آنسو تھے کہ ساون بھادوں کی طرح اُن کے گالوں پر سے پھسلتے ہوئے موتی کے ملائم بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔'' (ص ۲۳۔۲۴)

اس مضمون میں نانا جان کی شخصیت کے تمام نقوش کو نہایت عمدگی سے سمویا گیا ہے۔آپ نے دیکھا کہ اس مضمون کا انجام کتنے ڈرامائی انداز سے ہوا ہے اور نانا جان جو

بظاہر سخت دل نظر آتے تھے۔ اندر سے کتنے نرم دل تھے! حیرت ہے کہ مصنف نے اتنے بھرپور خاکے کو مضامین کے کھاتے میں ڈالا!

شمس آغا کے مضمون میں اُس کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ غربت اور افلاس کی پچھل پائیاں عمر بھر اُس کا پیچھا کرتی رہیں جن سے وہ شدید جدوجہد کے باوجود پیچھا نہ چھڑا سکا۔ وزیر آغا اس کی غربت کا ذکر دیکھیے، کتنے فنکارانہ انداز سے کرتے ہیں۔

''ادھر بیک وقت دو ایسے واقعات رونما ہوئے کہ وہ خوش باش جمگھٹوں اور بے فکری کے قہقہوں سے کنارہ کش ہو کر ایسی گہری اور پراسرار دنیا کی طرف پھر گیا جس سے آخری وقت تک نجات نہ پا سکا۔ یہ دو (۲) واقعات تھے محبت اور اُس کے دادا جان کی موت! دادا جان کی موت ایک ایسا حادثہ تھا کہ اس کے بعد اس کی اقتصادی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی اور اسے مجبوراً کالج کی تعلیم کو الوداع کہنا پڑا تعلیم کا سلسلہ قطع کر کے اپنے خوابوں کا گلا گھونٹ دینا اس ذہین اور حساس نوجواں کو کچل دینے کے لیے کافی تھا۔'' (ص ۲۶)

شمس آغا نے کئی خوبصورت افسانے تحریر کیے جنہیں مولانا صلاح الدین احمد نے بہت پسند کیا اور ''ادبی دنیا'' کی زینت بنایا، مگر اُس کی ساری ذہانت غربت اور افلاس کے ڈھیر تلے دب کر رہ گئی۔ وہ تواتر سے افسانے لکھتا رہتا تو اُس کا شمار اردو ادب کے بہترین افسانہ نگاروں میں ہوتا مگر مصائب و آلام نے اسے اتنی فرصت ہی نہ دی۔ اُس کی بے حسی اور مُردنی کا عمدہ نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

''مختصر یہ کہ اگرچہ اس کے بعد بھی اُس کی زندگی میں مدوجزر آئے اور کتنی ہی بار زندگی اور موت کے درمیان لٹکا لیکن وہ بے حسی اور مُردنی جو ایک بار چھا گئی

تھی، ہمیشہ قائم رہی۔ میں اُسے مجبور کر کے کشمیر لے گیا۔ خیال تھا کہ جگہ کی تبدیلی سے خیالات واحساسات میں تبدیلی آجائے گی اور شاید قنوطیت کے یہ تاریک بادل بھی چھٹ جائیں لیکن ناممکن وہ بیزار ہو چکا تھا اس سماجی اور سیاسی نظام سے اپنی جدوجہد اور مستقبل کے خوابوں سے اپنی دنیا اور کائنات سے!" (ص ۳۶)

اس مضمون کا اختتام بڑا دردناک اور رلا دینے والا ہے آخری جملے میں وزیر آغا نے تحفوں کو اخفا رکھ کر قاری کے ذہن میں تجسس پیدا کر دیا ہے۔ آخر وہ تحفے کیا تھے کس کے نام تھے۔

"تیسرے روز دہلی سے اس کا آخری خط آیا۔ یہ خط آج بھی میرے پاس محفوظ ہے اور اس کے خطرناک عزم کی غمازی کرتا ہے۔ دو دن بعد میرے نام ایک رجسٹرڈ پارسل آ گیا۔ اس پارسل میں بہت دور جانے والے مسافر کے چند آخری تحفے تھے لیکن یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ کیا تھے اور کس کے لیے تھے"! (ص ۳۷)

اس مضمون مین وزیر آغا نے شمس آغا کے اہم نقوش اُبھارے ہیں جن سے اس کی زندگی کے تمام گوشے کھل کر سامنے آگئے ہیں اور ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اسے برسوں سے جانتے ہیں۔ کیا آپ کو یہ مضمون بھی شمس آغا کا خاکہ نہیں لگا؟

وزیر آغا، مولانا صلاح الدین احمد سے بہت متاثر تھے۔ شمس آغا کے ذریعے اُنہیں مولانا سے ملنے اور باتیں کرنے کا موقع ملا۔ اس ملاقات کا ذکر انہوں نے بڑے دلکش انداز سے کیا ہے:

"معاً مجھے محسوس ہوا کہ دنیا ہی بدل گئی ہے۔ ہر شخص ہمیں غور سے دیکھ رہا

ہے جیسے ہم کسی اور ستارے سے زمین پر نازل ہو گئے ہوں! میں نے اپنے
سینے میں مسرت کے طوفان کو دباتے ہوئے آسماں کی طرف نظر اُٹھائی تپتی
ہوئی دو پہر میں آسمان دور دور تک پھیلا ہوا تھا مگر آسماں کے عین درمیان ایک
سفید لکۂ ابر نمودار ہو گیا تھا۔'' (ص ۴۴)

مولانا سے آخری ملاقات کا حال تحریر کرتے ہوئے وزیر آغا نے بہت سے
واقعات کا ذکر کیا ہے، مثلاً:

''مولانا کسی کا دل توڑنا تو جانتے ہی نہیں تھے چنانچہ اکثر و بیشتر دوسروں
کی خوشنودی پر اپنی مسرت، آرام اور فراغت کو قربان کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ
میں اُن کے دفتر پہنچا تو میز پر جھکے بڑے انہماک سے کوئی مضمون لکھ رہے
تھے، پاس ہی ٹیلی فون پڑا تھا۔ وہ ہر دو منٹ کے بعد ریسیور اُٹھاتے اور ''خوب
بہت خوب''، ''سبحان اللہ'' کہہ کر رسیور میز پر رکھ دیتے، پھر لکھنے میں مصروف
ہو جاتے۔ میں کوئی دس منٹ تک یہ تماشا دیکھتا رہا اور پھر میں نے حیران ہو کر
پوچھا۔ مولانا یہ کیا قصہ ہے۔ کہنے لگے مجھے ریڈیو والوں کے لیے یہ مضمون
آج ختم کرنا ہے اور (ٹیلی فون کی طرف اشارہ کر کے) حکیم احمد شجاع مجھے صبح
سے اپنے اشعار سنا رہا ہے، بتائیے میری حالت قابل رحم ہے کہ نہیں۔''

اس مضمون کا بغور مطالعہ کیا جائے تو مولانا کی شخصیت کے تمام نقوش اُبھر کر
ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ بالکل جیسے خاکے میں! دوسرا واقعہ ایک فٹ پاتھ کا ہے۔ ایک
قیمتی اور خوبصورت کار نے فٹ پاتھ پر قبضہ جمایا ہوا تھا:۔

مولانا نے آگے بڑھ کر ان صاحب سے کہا: اے عظیم کار کے مالک! یہ
ساری کشادہ سڑکیں تیری ملکیت ہیں۔ تو بے شک ان پر اپنی کار برق رفتاری

سے چلا لیکن یہ چار فٹ کا چوڑا فٹ پاتھ میرا اور مجھ ایسے لاکھوں افراد کا ہے جو اس ملک میں بستے ہیں۔ کیا تو یہ فٹ پاتھ بھی ہم سے ہتھیا لینا چاہتا ہے؟ مولانا کی بات سن کر وہ صاحب اس قدر خفیف ہوئے کہ انہوں نے فوراً اپنی کار فٹ پاتھ سے نیچے اُتاری اور دیکھتے ہی دیکھتے ہوا ہو گئے"! (ص ۵۰)

راجہ مہدی علی خاں، اردو طنز و مزاح کے شاعر تھے۔ وہ لاہور سے ہجرت کر کے دلی کی گلیوں میں بھٹکتے پھرے۔ پھر بمبئی جیسے بڑے شہر کے ایک گمنام گوشے میں روپوش ہو گئے۔ ادب کے میدان میں کئی شعراء طنز و مزاح کا جادو جگانے میں مصروف تھے۔ وزیر آغا نے انہیں خواب غفلت سے بیدار کر کے ایک بار پھر طنز و مزاح کے گھوڑے پر سوار کر دیا جو دیکھتے ہی دیکھتے سرپٹ دوڑنے لگا، لیکن جب میں نے انہیں "اردو ادب میں طنز و مزاح" بھجوائی (جس میں راجہ صاحب کی صلاحیتوں کا برملا اعتراف ہے) تو برف کے اُس پہاڑ میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ آفتاب کی شعاعیں تیز تھیں اور دھند چھٹ رہی تھی۔ چنانچہ برف کے پہاڑ نے پگھلنا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے قدموں سے کئی البیلی ندیاں پھوٹ نکلیں اور عظیم الشان دھارے کی صورت میں بہنے لگیں۔" (ص ۵۴۔۵۵)

مولانا صلاح الدین احمد اور راجہ مہدی علی خاں کے بارے میں یہ نثری ٹکڑا دیکھیے:

"دو شخصیتیں تھیں، مولانا صلاح الدین احمد اور راجہ مہدی علی خاں۔

دونوں اب اس دنیا میں نہیں مگر ان کی یادیں میرے ساتھ رواں ہیں اور جب کبھی تاریکی یلغار کرتی ہے تو وہ دبے پاؤں میرے خانۂ دل میں داخل ہو کر ہر طرف چراغاں کر دیتی ہیں۔" (ص ۵۳)

"کوہِ ندا کے مسافر" کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں، حمید احمد خاں کی وفات کا ذکر کتنے احسن انداز سے کیا ہے، دیکھیے:

آج میں نے اخبار میں پڑھا کہ خان صاحب بھی رخصت ہو گئے: محسوس ہوا کہ وہ مثلث جیسے والد صاحب مولانا اور خان صاحب کی شخصیتوں نے مرتب کیا تھا اب اپنے آخری خط مستقیم سے بھی محروم ہو گئی ہے۔ مگر وہ مقام جس کا احاطہ اس مثلث کے مستقیم خطوط نے کر رکھا تھا، آج بھی درخشاں ہے اور میں جب چاہوں محض اپنی آنکھوں کو ذرا میچ کر اس تابانی میں خود کو گم کر سکتا ہوں۔

مجید امجد، جنہوں نے درویشانہ زندگی بسر کی بڑے شہروں کے ہنگاموں سے دور ساہیوال جیسے چھوٹے اور پُرسکون شہر میں رہتے تھے۔ وہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر شاعری کرتے رہے۔ اُن کا شمار اردو نظم کے صفِ اول کے شعراء میں ہوتا ہے۔ وزیر آغا نے اُن کی وفات کا ذکر نہایت درد انگیز انداز سے کیا ہے:

''ہماری بدقسمت قوم بہترین تخلیقی صلاحیت رکھنے والے اپنے جیالے سپوتوں سے کیا سلوک کرتی ہے کہ وہ تنہائی، بے بسی اور کسمپرسی کے عالم میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں۔ مگر اُن پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ پھر ایک صبح، چند راہگیر کسی بند کھڑکی سے جھانکتے ہیں اور انہیں فرش پر کوئی لاش نظر آتی ہے فرش پر لاش کسی بے نام فقیر کی نہیں جو سردیوں کی رات میں ٹھٹھر کر مر گیا ہو یہ اپنے وطن کے اس شاعر کی لاش ہے جسے آنے والی نسلیں اقبال کے بعد ابھرنے والی دو تین منفرد آوازوں میں سے ایک قرار دیں گی۔'' (۶۶۔۶۷)

وزیر آغا نے غلام جیلانی اصغر کو برگد کا پیڑ کہا ہے۔ واقعی اُن میں برگد کے پیڑ کی جملہ خصوصیات موجود تھیں۔ وہ نہایت نرم دل انسان تھے، اپنی شگفتہ باتوں سے لوگوں کا دل موہ لیتے تھے۔ اس دورِ خرابی میں کہ زندگی بہت کٹھن ہے، ہنسنا تو کجا، لوگوں کے لبوں پر تبسم کی

ہلکی سی لکیر کر تک نمودار نہیں ہوتی۔ ایسے کڑے وقت میں دوسروں کا جی خوش کرنا چلچلاتی دھوپ میں برگد کا سایہ مہیا کرنے کے مترادف ہے۔ وزیر آغا نے کتنی خوبصورتی سے انہیں برگد کا سایہ کہا ہے، اُن کی زبانی سنیئے:

''مثلاً آپ دیکھیے کہ گوتم نے عرفان حاصل کرنے کے لیے برگد کی تلاش کی اور پھر اُس کے سائے میں بیٹھ کر سمادھی لگادی لیکن جیلانی صاحب نے اپنی ذات کے اندر سے برگد کو جنم دیا اور پھر اپنے ہی سائے میں دھونی رما کر بیٹھ گئے۔'' (ص ۷۲)

غلام جیلانی اصغر، مشاعروں سے لے کر میوہ منڈی کے نیلام، دوستوں کی بیمار پُرسی اور معزز شہری کی رسم قل، ہر جگہ شرکت کرتے۔ وہ رات دن کام میں مصروف رہتے تھکاوٹ اور نقاہت کے الفاظ اُن کے لغت میں موجود ہی نہیں تھے۔ اُن کے دبلے پتلے جسم میں بلا کی شکتی تھی۔ وزیر آغا اُن کی خوبیوں کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اللہ میاں نے آدم کی تخلیق کے فوراً بعد جیلانی صاحب کی تعمیر کا کام شروع کروایا ہوگا اور اس کے بعد جو تھوڑی سی انرجی بچی ہوگی، اس سے شہر کے باقی ادیبوں کے بے جان پتلوں میں جان ڈالی ہوگی۔'' (ص ۷۳)

وزیر آغا کا اسلوب اس قدر دلکش اور پر کشش ہے کہ ایک ہی مضمون کو متعدد بار پڑھنے سے بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ میں نے اپنے اس مضمون میں ''شام دوستاں آباد'' کی تحریروں میں خاکے یا اُن کی پر چھائیاں تلاش کی ہیں۔ مگر اس کتاب کے ناشر کی نظر میں وزیر آغا کے اسلوب میں کئی اور خوبیاں بھی موجود ہیں جنہیں اُس نے کتاب کے فلیپ پر تحریر کیا ہے۔

''شام دوستاں آباد'' وزیر آغا کی انوکھی کتاب ہے۔ اسے سوانح، تنقید، انشائیہ،

خاکہ، سیاحت، غرضیکہ کسی بھی جانے پہچانے خانے میں قید نہیں کیا جاسکتا گو اس میں ان سب کی پرچھائیاں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ کتاب کی اصل اہمیت ایک تو مصنف کے بے مثال اسلوب کے باعث ہے، دوسرے اس لیے کہ اس کتاب میں مصنف نے شخصیتوں، کتابوں اور تصویروں کا سہارا لے کر اپنی ذات ہی کو منکشف کیا ہے!

............☆☆............

ڈاکٹر انور سدید کی خاکہ نگاری

اُردو ادب میں ڈاکٹر انور سدید محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ انہوں نے مختلف اصناف پر متعدد کتب تصنیف و تالیف کی ہیں۔ وہ زود نویس ادیب ہونے کے باوجود معیار کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ دوسری اصناف کی طرح خاکہ نگاری میں بھی انہیں خاصی مہارت حاصل ہے۔ ان کے خاکوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ ''محترم چہرے'' دوسرا ''قلم کے لوگ'' اور تیسرا ''ادیبانِ رفتہ'' ہے۔

خاکہ نگاری آسان کام نہیں ہے۔ ذرا سی لاپروائی سے خاکہ اپنا توازن کھو کر کبھی مدلل مداحی اور کبھی تنقیص کے خطے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ خاکہ نگاری خاردار جھاڑیوں کے درمیان دامن بچا کر چلنے کا نام ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ڈاکٹر انور سدید نے خاکے کے توازن کو زیادہ تر برقرار رکھا ہے۔ اور شخصیت کی خوبیوں کے ساتھ اس کی خامیوں کا ذکر بھی ہلکے پھلکے انداز سے اس خوبی سے کیا ہے کہ توازن بگڑنے نہیں پایا۔

جن لوگوں کے خاکے تحریر کئے گئے ہیں۔ وہ اُردو ادب کی معروف شخصیات ہیں۔ ان میں سے اکثر کے ساتھ انہوں نے خاصا وقت گزارا ہے۔ محض سنی سنائی اور کتابوں میں پڑھے ہوئے واقعات کی اینٹوں پر خاکے کی عمارت تعمیر کرنے کی بجائے شخصیت کے اندر کے منطقوں کی سیاحت کے بعد خاکے تحریر کئے گئے ہیں۔

ہر شخصیت دھند کی دبیز تہ کے پیچھے چھپی ہوتی ہے۔ اس دھند کو ہٹا کر خاکہ نگار جب اس کے ظاہری اور باطنی نقوش کو ہائی لائٹ کرتا ہے تو شخصیت کا ظاہر اور باطن چم چم کرتا منظر عام پر آجاتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کے خاکوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے اکثر ادباء کو ان کی تصانیف اور فن کی مدد سے ان کی شخصیت کا تعارف اس انداز سے کرایا ہے کہ ان کی شخصیت کے اہم نقوش ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ ''تحقیق کے مردِ آہن'' میں وہ لکھتے ہیں:

> ''سہیل بخاری اُردو کے مخلص خادم اور سچے ادیب ہیں، انہوں نے اُردو ادب سے عشق کیا ہے لیکن اس سے پیشہ ورانہ سلوک کبھی نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ تحقیق وتنقید کی ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھنے اور زندگی کی ستر بہاریں دیکھنے کے بعد بھی ان کے ہوش وحواس قائم رہے اور ان میں نخوت پیدا نہ ہوئی کہ انسان انہیں حشرات الارض نظر آنے لگیں۔''

ڈاکٹر انور سدید نے صہبا لکھنوی کا خاکہ ان کے رسالہ ''افکار'' کے حوالے سے لکھا ہے۔ صہبا لکھنوی مدیر کے علاوہ ایک خوبصورت شاعر اور ادیب بھی تھے۔ جن کا اظہار انہوں نے افکار کے ذریعے بالکل نہیں کیا۔ میں جب سے ''افکار'' کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ میں نے کبھی ان کی کوئی غزل یا نثر پارہ ''افکار'' کی زینت بنتے نہیں دیکھا۔ انہیں ''افکار'' سے اس درجہ محبت تھی کہ انہوں نے اپنے اندر کے شاعر اور ادیب کو اس کی نذر کر دیا تھا اگر میں یہ کہوں کہ ''افکار'' ایک ایسا طوطا تھا جس میں صہبا لکھنوی کی جان بند تھی مبالغہ ہرگز نہ ہوگا۔ اساطیری کہانیوں میں طوطے کی جان نکلتے ہی دیو کی جان نکل جاتی ہے۔ اساطیری کہانیوں کے برعکس صہبا لکھنوی اس آب وگل کی دنیا سے پہلے کوچ کر گئے۔ ان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد طوطا بھی اپنا رختِ سفر سمیٹ کر خاموش ہوگیا۔

میرے خیال میں یہ خاکہ ڈاکٹر انور سدید کے عمدہ خاکوں میں سے ایک ہے۔ صہبا اور ''افکار'' کے حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''صہبا لکھنوی کی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے اپنے ممدوحین کو ان کے مقام اور مرتبے کے مطابق خراجِ تحسین پیش کیا ہے لیکن اس سے اپنی تعریف و تحسین کا کوئی زاویہ نمایاں نہ ہونے دیا چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ صہبا لکھنوی نے ''افکار'' کو اپنی شہرت کا کبھی وسیلہ نہیں بنایا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کہ صہبا لکھنوی نے اپنی ذات کو ''افکار'' میں گم کر دیا تھا۔ صہبا اور ''افکار'' ایک ہی شخصیت کے دو نام تھے۔ صہبا کا انعکاس ''افکار'' سے اور ''افکار'' کا انعکاس صہبا سے ہوتا تھا۔''

ڈاکٹر انور سدید آنس معین کے اندر چھپے ہوئے خوف اور عدم تحفظ کے احساس کو ان کی غزل میں تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ جس کے ذریعے آنس معین کی سائیکی کو سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ اس شعر سے دیکھئے ان کے اندر کا خوف کس طرح منعکس ہوتا ہے۔

جانتے ہو کس قدر خائف ہے اپنے آپ سے
سنگ جیسا آدمی جو کانچ کے اس گھر میں ہے

ایک فنکار کی شخصیت کے نقوش کا آئینہ اس کی تحریریں ہوتی ہیں۔ تخلیق کے اس آئینے میں اسی تخلیق کار کے ظاہری اور باطنی گوشوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر انور سدید نے شخصیت کے خاکے رقم کرتے ہوئے شخصیات کے ان گوشوں کو ہائی لائٹ کرنے کے لئے ان پہلوؤں کا انتخاب کیا ہے جو ان کی شخصیت کے نقوش کو مزید واضح کر سکیں۔

ڈاکٹر انور سدید کی شخصیت میں شگفتگی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ جس سے انہوں نے خاکے تحریر کرتے ہوئے باقاعدہ استفادہ کیا ہے مگر وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ خاکے میں مزاح ایک حد تو داخل کیا جا سکتا ہے مگر اس کا کثرتِ استعمال نہ صرف خاکے کو مجروح کرتا ہے بلکہ بعض اوقات خاکہ خاکے منطقے سے نکل کر مزاح کے جزیرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ خاکہ لکھتے وقت مزاح اور شگفتگی کو خاکے میں داخل ہونے کی اتنی ہی اجازت دیتے ہیں جتنی کہ خاکے کو ضرورت ہے۔

ڈاکٹر انور سدید اپنے خاکوں کی شخصیات کے گرد واقعات کے انبار نہیں لگاتے کہ شخصیات کے اصل خدوخال نمایاں نہ ہو سکیں۔ وہ صرف ان واقعات کو خاکے میں داخل کرتے ہیں جن سے شخصیت کا گہرا تعلق ہوتا ہے اور اس کے نقوش واضح ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی شخصیت کی بھی خاکے میں اتنی نمائش نہیں کرتے کہ موضوع خاکہ کی شخصیت اس کے زیر اثر آجائے۔ وہ خاکے میں اپنی شخصیت کو اتنا اور اس وقت داخل کرتے ہیں، جتنی اور جس وقت اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ میرزا ادیب کے خاکے ''حباب آسا'' میں رقم طراز ہیں:

''مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ جب میرزا ادیب ایک شاعر کی ساٹھویں سالگرہ کے جشن میں مضمون پڑھ کر واپس آرہے تھے تو وہ اس قسم کی رومانی مایوسی سے دوچار تھے۔ مجھے علم تھا کہ میرزا ادیب بھی کا ساٹھواں عبور کر چکے ہیں۔ ادب میں ان کی خدمات کسی دوسرے ادیب سے کم نہیں لیکن کسی نے کبھی ان کا جشن سالگرہ نہیں منایا۔ کسی رسالے نے ان پر خاص نمبر شائع نہیں کیا۔ درد کی ایک لہر میرزا ادیب کے دل سے میرے دل کی طرف مسلسل دوڑ رہی تھی۔ لیکن ہم دونوں خاموشی سے الفلاح سے وائی ایم سی اے کی طرف

آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ میں نے ہمت کی الفاظ میرا ساتھ نہ دے سکے کہ
ان سے دریافت کروں مقبول اور بڑے ادیب میں کیا فرق ہے۔"

ڈاکٹر انور سدید کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ خاکہ تحریر کرتے ہوئے کفایت لفظی سے کام لیتے ہیں۔ وہ ایک بڑے خیال کو چند سطور میں خوبصورتی سے بیان کر دیتے ہیں۔ مختصر نویسی بہت مشکل کام ہے۔ اس میں خاصی مہارت اور مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ وسیع المطالعہ بھی ہیں اور ادب تخلیق کرتے ہوئے ان کی عمر گزر گئی ہے۔ انہوں نے احمد بشیر کے خاکے میں جو ان کی تیسری کتاب "ادیبانِ رفتہ" میں شامل ہے۔ احمد بشیر کے گھرانے کا تعارف چند سطور میں اس خوبصورتی سے کرایا ہے کہ اس گھرانے کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے:

"اس عرصہ میں احمد بشیر سے متعدد بار ملنے کا موقع ملا۔ ان کا گھرانہ ادیبوں کا آشیانہ ہے۔ ایک بیٹی نیلم بشیر احمد آف...... دوسری بیٹی بشریٰ انصاری فلم اور ٹی وی کی آرٹسٹ ہیں۔ اس کی بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ احمد بشیر کی بیٹی ہے۔ بہن پروین عاطف بھی ممتاز افسانہ نگار ہیں"۔

ڈاکٹر انور سدید ابتداء میں قاری پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتے ہیں جو خاکے کے اختتام تک جاری رہتی ہے۔ وہ قاری کو اپنے خاکے کی شخصیت کی سیر کرواتے ہوئے مخل نہیں ہوتے بلکہ قاری کو شخصیت کے جزیروں کو اس کی اپنی آنکھ سے دیکھنے کی کھلی چھٹی دے دیتے ہیں۔ اس ضمن میں انجم رومانی کے خاکے کے ابتدائی جملے ملاحظہ کیجئے:

"انجم رومانی بیمار تو کافی عرصے سے چلے آرہے تھے لیکن یہ علم نہیں تھا کہ وہ زندگی کا رختِ سفر سمیٹ رہے ہیں اور ان کے بدن کا سارا لہو مشتِ پر میں رواں ہو گیا ہے اور وہ جلد ہی ان ستاروں کی طرف پرواز کرنے والے ہیں

جن کے بارے میں انہوں نے خود کہہ رکھا تھا۔"

تاروں پہ انجم کے سوا کون نظر دوڑائے گا

انساں محوِ دنیا ہے، اور دنیا محوِ انساں ہے

بہت سے تخلیق کاروں کو نقادوں کا یہ رویہ ناپسند ہے کہ ان کے خونِ جگر سے تخلیق کردہ فن پاروں پر تنقیدی نظر ڈال کر ان میں موجود خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کی نشاندہی بھی کر دیتے ہیں مگر ابن انشاء ایک ایسے نامور تخلیق کار تھے جو نقادوں کو اپنے فن پر تنقید کرنے کا پورا پورا حق دیتے تھے۔ ڈاکٹر انور سدید "ادیبانِ رفتہ" میں ان کی اس خوبی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"تنقید کو قبول کرنے اور نقاد کے خلاف قرولی کھینچنے کی بجائے اسے بڑھ کر محبت سے گلے لگا لینے کا رجحان ابن انشاء کے مزاج کی ایک عمدہ خصوصیت ہے اور شاید ان کی شخصیت کے اساسی زاویوں میں شامل ہے۔"

ڈاکٹر انور سدید دورِ حاضر کے ایک اہم خاکہ نگار ہیں اور ان کی خاکوں کی تینوں کتابیں اُردو ادب کی تاریخ میں ایک خوشگوار اضافہ متصور کی جائیں گی۔

............☆☆............

انور سدید آئینۂ غزل میں

غزل میں جب شاعر اپنی واردات قلبی، جذبات اور احساسات کا بیان خلوص کے رنگ میں ڈبو کر کرتا ہے تو اس میں پیدا ہونے والی نشتریت اس کے کلام کو معجزہ بنا دیتی ہے۔ میر کو خدائے سخن کا خطاب دلانے والی یہی چیز ہے۔ شاعر خارجی مشاہدات اور تجربات بیان کرتے وقت بھی ان میں اپنے خون جگر کی آمیزش کرتا ہے تا کہ کلام کا سحر برقرار رہے۔

کاروان غزل میں بے شمار شعرأ شامل ہیں، جن میں میر، غالب، ولی، آتش، داغ، مومن، انشا، جرأت، بہادر شاہ ظفر، ذوق، مصحفی، حسرت، یگانہ، اصغر، جگر، فراق، حفیظ، احسان، فیض، مجروح، ساحر، اختر شیرانی، شکیل، منیر، صوفی تبسم، عابدہ شکیب ناصر، وزیر آغا، شہرت، ظہیر، مجید امجد، مصطفیٰ زیدی، ظفر اقبال، زہرہ نگار، ادا جعفری، کشور ناہید، مرتضیٰ برلاس، احمد فراز، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض، شہزاد احمد، امجد اسلام امجد، شیر افضل جعفری، تابش دہلوی، جعفر طاہر، محمود شام اور رام ریاض کے نام بہت نمایاں ہیں۔ جو اہم نام اس وقت میرے حافظے کی گرفت میں نہیں آسکے ان سے میں معذرت خواہ ہوں۔

غزل کے اسی کارواں میں ڈاکٹر انور سدید بھی شامل ہیں۔ وہ بنیادی طور پر نقاد ہیں تاہم انہوں نے نظم ونثر کی بہت سی اصناف پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ غزل بھی انہوں

نے جم کر کہی اور خوب کہی ہے۔وہ اپنے دو اشعار میں آمد اور آورد کے فرق کو نہایت عمدہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔عام لوگوں کی نسبت شعراء اس کیفیت کو زیادہ احسن طریق پر سمجھ سکتے ہیں کیونکہ انہیں بھی بار ہا اس کیفیت سے گزرنا پڑتا ہے۔

پہلے تو ایک لفظ کا کوندا چمک اٹھا　　پھر دفعتاً خیالوں کی برسات ہو گئی

کچھ مضامین غیب سے اترے　　اور پھر کھلتا گیا بابِ سخن

انور سدید لفظوں کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں۔ان کی نظم ونثر کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لفظوں کے استعمال میں بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں اور انہیں اس مہارت سے استعمال کرتے ہیں کہ لفظوں کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔وہ غزل میں اشارے کنائے اور رمز وایما سے بات کرتے ہیں اور ایجاز واختصار سے کام لیتے ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ کسی بات کو واشگاف لفظوں میں بیان کرنے سے شعر کا حسن مجروح ہو جاتا ہے اور اس کا سحر قائم نہیں رہتا۔لفظوں کی ساحری کے بارے میں کہتے ہیں۔

لفظ بھی ساحری انور سدید　　آنکھ کی جادو بیانی اور ہے

ہر تازہ روش اور نئے اسلوب کے پس پردہ پرانی روشوں اور اسالیب کی کار فرمائی نظر آتی ہے اور جدیدیت کی جڑیں روایت کی زمین ہی میں پیوست ہوتی ہیں۔اس لئے جدید کلی طور پر روایت سے انحراف نہیں کرتا بلکہ اس کا یہ انحراف جزوی طور پر ہوتا ہے۔ڈاکٹر انور سدید بھی روایت سے جزوی طور پر انحراف کرتے ہیں۔اسی طرح وہ روایت اور جدت دونوں سے جڑے رہتے ہیں۔ان کی غزل کا تانا بانا روایت اور جدت کے دھاگوں سے تیار ہوتا ہے اور دونوں کی باہم آمیزش سے جب شعر نمودار ہوتا ہے تو وہ ایک نئے رنگ اور آہنگ سے آراستہ ہوتا ہے۔

مجھے طوفان کا خطرہ نہیں ہے　　مری جانب کنارا آ رہا ہے

ترے قد سے بہت لمبا ہے انور ترے پیچھے جو سایا آ رہا ہے

انور سدید نے اپنے شاعر ہونے کا بلند و بانگ دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ جس طرح میر نے دردِ دل جمع کر کے دیوان بنایا تھا اسی طرح انور سدید بھی اپنی غزل کو متاع دردِ دل کہتے ہیں اور اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ متاع دردِ دل ان کے دوستوں میں تقسیم ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنے اندر کے دکھوں کو غزل کی شال میں ٹانک کر لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔

میری غزل کا ہے انور سدید یہ حاصل متاع درد مرے دوستوں میں بٹ جائے

شہرت وہ بری بلا ہے جو اچھے اچھوں کو اپنا مطیع بنا لیتی ہے۔ اس کے زیر اثر آنے کے بعد اکثر لوگ خود بینی، خود پرستی اور خود نمائی جیسے امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور خود کو ماورائی مخلوق سمجھنے لگتے ہیں مگر انور سدید اتنے معروف ہونے کے باوجود عاجزی اور فروتنی کی چادر کو اپنے گرد لپیٹے رہتے ہیں۔ اس لئے غرور و تکبر جیسی بلائیں انہیں مغلوب نہیں کر پائیں جس کا مظاہرہ وہ اپنی عام زندگی میں بھی کرتے ہیں اور اس بات کی تصدیق ان کے اس شعر سے بھی ہو جاتی ہے۔

انور سدید عام سا بندہ ہے اس کے ساتھ
مٹی پہ بیٹھ، دھول میں اَٹ کر کلام کر

اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ پر تکلف، پر جاہ اور پُر رفعت زندگی گزارنے کے بعد جب وقت ان کی بساط رنگین الٹ دیتا ہے تو وہ بڑھاپے کی زد میں اس طرح آ جاتے ہیں کہ تنہائی کے علاوہ کوئی ان کا مونس و غم خوار نہیں رہتا۔ اس کے برعکس ایک تخلیق کار کے جسم پر بڑھاپا اپنے اثرات تو ڈالتا ہے مگر اس کا فن اسے بوڑھا نہیں ہونے دیتا۔ وہ جسمانی طور پر جوں جوں بوڑھا ہوتا جاتا ہے اس کی تخلیق پر توں توں شباب آتا جاتا ہے۔ تخلق نہ صرف اسے تنہائی کی ڈائن سے بچاتی ہے بلکہ شہرت کی رفعتوں پر بھی پہنچاتی

ہے۔اس ضمن میں انور سدید کہتے ہیں۔

میں خزاں دیدہ شجر کی طرح گمنام سا تھا
مجھ کو وقعت تیری تصویر بنانے سے ملی

اس وقت انور سدید عمر کے اس حصے سے گزر رہے ہیں جہاں جسمانی نقاہت اور قوت مدافعت میں کمی کی وجہ سے مختلف قسم کے امراض استقبال کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔شباب کے جذبات پر برف جم جاتی ہے اور دل میں موٴجزن دریا کی رفتار نہایت سست ہو جاتی ہے۔جسمانی بیماریوں اور حافظے کی کمزوری کا ذکر وہ اپنے دوستوں سے بھی کرتے رہتے ہیں اور اس کا اظہار اپنی غزل میں بھی کیا ہے۔

پھر یوں ہوا کہ گرمیٔ جذبات مٹ گئی
جو موٴجزن تھا دل میں وہ دریا اتر گیا
وہ بھی نہ میری یاد کو محفوظ رکھ سکا
میرے بھی دل سے اس کا سراپا اتر گیا

یاد کو محفوظ نہ رکھ سکنا اور دل سے سراپا اتر جانا شباب کے رنگین دور کے گزر جانے کی دلیل ہے۔ظاہر ہے اس کے بعد بڑھاپا مشکیں باندھ دیتا ہے اور اس کی بندش آہستہ آہستہ سخت ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر انور سدید کی غزل میں تضمین کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔انہوں نے چند معروف شعراء کے مصرعوں پر اتنی عمدگی سے گرہیں لگائی ہیں کہ تضمین کا گمان تک نہیں ہوتا۔

ہر لمحہ اب نشیب کی جانب رواں ہیں ہم
"نے باگ ہاتھ میں ہے، نہ پا ہے رکاب میں"
"ستارہ کیا مجھے افلاک کی خبر دے گا"

نظر سے اس کی تو اپنا جہاں ہے پوشیدہ

مجید امجد کی معروف غزل جس کی ردیف ''گلاب کے پھول'' ہے۔انور سدید نے اس زمین میں اشعار کہہ کر ان کی جدائی کے غم کی شدت کو بھی بیان کیا ہے، انہیں خراج تحسین بھی پیش کیا ہے اور ان کی مغفرت کی دعا بھی کی ہے۔

مسافر ''شب رفتہ'' ملول تیرے بغیر
شجر، طیور، ندی، تتلیاں گلاب کے پھول
یہ نوحہ تری زمیں کا ثمر مجید امجد
تری زمیں میں کھلیں جاوداں گلاب کے پھول

دور حاضر کے معاشیاتی، معاشرتی اور سیاسی حالات نے انسان کو جس ڈگر پر لا کر کھڑا کر دیا ہے وہ بے حد حیران ہے کہ اپنے جسم و جان کے رشتے کو کس طرح برقرار رکھے، معاشی اور سیاسی حالات سے کس طرح نبرد آزما ہو۔وہ وقت کے پیچ و خم میں اس درجہ الجھ گیا ہے کہ فرصت کے لمحات عنقا ہو چکے ہیں۔انور سدید جب ان حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو بے ساختہ ان کے نوک قلم سے اس قسم کے اشعار صفحہ قرطاس پر نظر آنے لگتے ہیں۔

اب عشق کرنے کی نہیں لوگوں کو فرصتیں
الجھا رہے ہیں وقت کے پیچاک سر بسر!

مجید امجد کی طرح انور سدید کو بھی درختوں، پودوں اور پھولوں سے والہانہ لگاؤ ہے۔جب لوگ منفعت حاصل کرنے کے لئے بے دریغ ان کے جسموں پر آرے اور کلہاڑے چلاتے ہیں تو وہ منظر دیکھ کر انہیں بہت دکھ ہوتا ہے۔دکھ کی یہ پرچھایاں ان کے چہرے کے علاوہ غزل میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ملاحظہ کیجئے۔

نالہ بپا جو دل میں تھا، کس نے سنا اسے

آری سے کاٹ لے گئے گونگے درخت کو
شاخیں گئیں تو گھونسلے سارے بکھر گئے
حسرت سے دیکھتے ہیں، پرندے درخت کو

ڈاکٹر انور سدید نے غزل کی طویل مسافت طے کرنے کے بعد پہلا ٹھہراؤ؟ ''پرندہ سفر میں'' کے مقام پر لیا ہے۔اس مجموعہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی غزلوں کے انتخاب میں دقت نظر سے کام لیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس میں شامل تقریباً تمام غزلیں سادہ اور مترنم بھی ہیں،تنوع اور منفرد اسلوب سے مملو بھی،ان کے شعری مجموعہ ''پرندہ سفر میں'' کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا رقمطراز ہیں۔

''مجموعی طور پر دیکھئے تو ڈاکٹر انور سدید تنقید،افسانہ،انشائیہ اور شاعری چاروں جریدوں سے اپنے دوام ابد کو مثبت کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے''۔

............☆☆............

نئے جزیرے کی سیاحت

ڈاکٹر انور سدید کے ادب سمندر میں نمودار ہونے والے نئے جزیرے ''مشفق خواجہ...... ایک کتاب'' کی سیاحت کا مجھے موقع ملا تو اس کے دل فریب، دل افروز اور حسین مناظر نے قدم قدم پر روکا اور اس وقت تک آگے نہ جانے دیا جب تک کہ میں نے ان مناظر کے حُسن کو اپنے اندر نہیں اُتار لیا۔ اس جزیرے کو چھے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ شخصیت، فن، چند کتابیں، خطوط، سخن در سخن اور کالم۔ کسی علاقے کی سیاحت سے قبل یہ بات ذہن نشین ہونی چاہئے کہ صرف اہم اور جاذب نظر مقامات کی سیاحت کی جاتی ہے۔ تمام چھوٹے بڑے حصوں کو دیکھنا مشکل ہوتا ہے۔

سب سے پہلے ہم اس جزیرے کے پہلے حصے سے دل و دماغ کو تازہ اور شاداب کرتے ہیں۔ یہ شخصیت کی قلمرو ہے، عام آدمی کی شخصیت نہیں اُردو ادب کے جید نقاد، محقق، کالم نگار، شاعر اور مزاح نگار مشفق خواجہ کی شخصیت ہے۔ ڈاکٹر انور سدید بتاتے ہیں کہ مشفق خواجہ اپنی ذات میں انجمن تھے اور ان کا وجود انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتا تھا۔ ظاہر میں خانہ نشین مگر رابطہ ساری دنیا کے ادیبوں سے تھا۔ مولوی عبدالحق کی قربت نے محقق بنا دیا تھا مگر مزاج میں خشکی کی بجائے ظرافت اور شگفتگی تھی۔ علمی، ادبی اور تحقیقی کاموں میں دوسروں کی معاونت کر کے انہیں خوشی ہوتی تھی۔ اس لئے ان کے گھر پر تشنگانِ علم کا ہجوم رہتا تھا۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے والوں کو ان کا مطلوبہ مواد اپنے

خرچ پر فوٹوسٹیٹ کروا کر بھیجا کرتے تھے۔ ان کی اس خوبی کا اظہار راشد شیخ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''خواجہ صاحب نے اپنے قیمتی وقت اور صلاحیتوں کو دوسروں کے لئے وقف کر دیا تھا۔''

مشفق خواجہ ایک خط میں اپنے گھر کے بارے میں بتاتے ہیں:

''یعنی وہ مکان جو نہ دولت خانہ ہے نہ غریب خانہ بلکہ ایک چھوٹا سا کتب خانہ ہے جہاں جگہ کی کمی کے باوجود ایک وسیع دنیا آباد ہے اور میں اس کی سیاحت میں رہتا ہوں۔''

اس چھوٹے سے کتب خانے نے گھر کا ایک بڑا حصہ اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ بہ قول خواجہ صاحب جبھی تو وہاں ایک وسیع دنیا آباد تھی۔

مشفق خواجہ اپنی شہرت سے بالکل بے نیاز تھے۔ انہوں نے اپنے بارے میں لکھے گئے تعریفی مضامین چھاپنے کی اجازت نہیں دی۔ ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں۔

''بے شمار اہل قلم نے ان پر مضمون لکھے۔ خواجہ صاحب نے یہ سب مضامین منگوا لئے اور پڑھے بغیر ایک تھیلے میں بند کر کے کونے میں ڈال دیے۔ کسی مضمون کو چھاپنے کی اجازت نہیں دی۔''

انور سدید ایک اور جگہ تحریر کرتے ہیں:

''ایک دفعہ ڈاکٹر وزیر آغا نے انہیں بتائے بغیر ان کی شخصیت پر مضمون لکھا تو ناراض ہو گئے اور آئندہ اس قسم کا کام کرنے سے سختی سے منع کر دیا۔''

ادب میں شہرت سے اتنی بے نیازی بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اکثر چھوٹے بڑے اہل قلم شہرت کی دیوی کے پیچھے بھاگتے بھاگتے حال سے بے حال ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید بتاتے ہیں کہ مشفق خواجہ کا فوٹوگرافی کا شوق فزوں تر تھا۔ گھر آئے مہمانوں کا عکس اپنے کیمرے میں اُتار کر البم میں محفوظ کر لیتے تھے۔ انہوں نے اپنے ادبی جریدے ''تخلیقی ادب'' کے ذریعے تخلیق کاروں کو اعزازیہ دینے کی روایت بھی ڈالی۔ شہر میں نقدی مشاعرہ ہوتا تو اپنے دوستوں کے نام فون پر لکھوا کر انہیں اطلاع دے دیتے تھے جس کی وجہ سے غیر معروف شعراء بھی بھاری لفافوں سے جیبیں گرم کر کے اپنے گھروں کو لوٹا کرتے تھے مگر وہ خود کتاب خرید کر اور رسالے کو چندہ بھیج کر منگوایا کرتے تھے۔ ان کی اس سخاوت اور حاجت روائی کی وجہ سے بعض منفعت پسند اور خودغرض لوگ ان سے بے جا توقعات باندھ کرنا روا اغراض کی تکمیل میں ان کی معاونت کے طلب گار ہوتے تو خواجہ صاحب انکار کر دیتے تھے، جس کی وجہ سے ان کی دشمنی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

خطوط نگاری خالصتاً ایک نجی فعل ہے۔ مکتوب نگار مکتوب الیہ کو اس بھروسے پر اپنے دل کی باتیں بلاتأمل بتاتا ہے کہ اس کے دل دریا سے اچھل کر کبھی باہر نہیں آئیں گی۔ ایک عام آدمی کے خطوط کی تو کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ بہ قول ڈاکٹر انور سدید مشفق خواجہ بڑے ادیبوں کے خطوط مخفی رکھنے کے حق میں نہیں تھے۔ وہ خطوط کو مکتوب نگار کی نہیں مکتوب الیہ کی ملکیت قرار دیتے تھے۔ معروف ادباء کے خطوط ان کی زندگی ہی کے عکاس نہیں ہوتے ان کے خطوط کے آئینے میں ان کے عہد اور معاصرین کے بہت سے نادر پہلوؤں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ مشفق خواجہ نے اپنے خطوط کی اشاعت پر بھی پابندی نہیں لگائی تھی۔ چنانچہ ان کے خطوط کے ذریعے ان کی زندگی کے بہت سے پوشیدہ گوشے منظر عام پر آئے ہیں۔ ان کے خطوط کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ طنز و مزاح اور ظرافت سے مملو ہوتے ہیں۔ وہ ایک خط میں رقم طراز ہیں:

''آج بہت ہمت کر کے تمہیں ''خدائے سخن'' کہہ کر مخاطب کر رہا ہوں۔

اُمید ہے کہ تم خوش ہو جاؤ گے اور دُعا کرو گے کہ میرا انجام بہ خیر ہو۔ نمرود کی خدائی میں نمرود ہی کا بھلا ہوا تھا۔ اب دیکھنا ہے کہ تمہاری خدائی میں کس کس کا خانہ خراب ہوتا ہے۔''

ایک خط میں اپنی جسمانی کمزوری کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''بیگم صاحبہ سے کہتا ہوں، ساتھ چلیئے۔ تو وہ کہتی ہیں کہ جب تم کسی لائق تھے تو اکیلے سفر کرتے تھے، اب کسی لائق نہیں تو گھر میں رہو۔''

پروفیسر جعفر بلوچ کے نام ایک خط کی چند سطور ملاحظہ کیجیے:

''لیکن بھائی صاحب آپ کو شاعری کے علاوہ کوئی کام نہیں۔ نثر لکھنا اگر شایان شان نہیں تو منظوم خط ہی لکھئے۔ ویسے بھی نظم آپ آسانی اور روانی سے لکھ لیتے ہیں۔ نثر کے لئے دردزہ کیوں جھیلا جائے۔''

انہوں نے ایک خط میں ظفر اقبال کے لکھے ہوئے مضمون پر یوں تبصرہ کیا ہے:

''ظالم نے تمہاری کتاب پر مضمون مزے کا لکھا ہے۔ تمہاری برائی ایسے کی ہے جیسے تعریف کر رہا ہو۔ مثلاً تمہیں منفرد شاعر مانتا ہے مگر ایسے شعراء کے درمیان جن کی کوئی اہمیت نہیں۔''

طنز و مزاح کے حوالے سے اس جزیرے کے دو چھوٹے چھوٹے حصے سخن در سخن اور کالم پنڈی اور اسلام آباد کی طرح جڑواں شہر ہیں۔ اگر ڈاکٹر انور سدید ''مشفق خواجہ۔ خطوط کے آئینے میں'' کا عنوان بدل کر تینوں کو یکجا کر دیتے اور مشفق خواجہ کی مزاح نگاری، خامہ بگوش کے قلم سے اور سخن ہائے گفتنی کو بھی ان کے قرب و جوار میں جگہ عطا فرما دیتے تو یہ چھوٹے چھوٹے خطے آپس میں مل کر طنز و ظرافت، شگفتگی اور لطافت کی ایک وسیع مملکت بن سکتی تھی۔ جس سے سیاحت میں آسانی اور لطف میں فراوانی پیدا ہو جاتی۔

میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے قارئین کی دلچسپی کے لئے خشک و تر حصوں کو آپس میں اس طرح ملا دیا ہے کہ جزیرے کی سیاحت کرتے ہوئے خشکی کا کہیں بھی احساس نہ ہو۔

سخن در سخن میں مشفق خواجہ ڈاکٹر انور سدید کی زود نویسی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''لیکن ڈاکٹر انور سدید کو خدا نے طبع کی روانی کے ساتھ ساتھ قلم کی روانی بھی عطا کی ہے۔ وہ اتنی آسانی اور اتنی فراوانی سے لکھتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اگر ان کے اخباری کالموں ہی کو سامنے رکھا جائے جو ایک درجن سے زیادہ فرضی ناموں سے شائع ہوتے ہیں، تو ان میں استعمال ہونے والے کاغذ سے دبستانِ سرگودھا کے تمام ہمدردوں، بہی خواہوں اور نوحہ گروں کے لئے کاغذی پیرہن تیار کرائے جا سکتے ہیں۔''

ایک اور مقام پر وہ ڈاکٹر انور سدید کی کتاب ''انشائیہ اُردو ادب میں'' کو یوں طنز کا نشانہ بناتے ہیں:

''بہر حال ہم نے اس کتاب کو جس قدر بھی دیکھا مفید پایا۔ خصوصاً ان لوگوں کے لئے جنہوں نے ساری زندگی میں ایک آدھا انشائیہ لکھا ہے اور اس کتاب میں ان کا بھی ذکر موجود ہے۔ اگر اس کتاب کی اشاعت کا پہلے سے علم ہوتا تو ہم بھی ایک آدھ انشائیہ لکھ کر شہیدوں میں شامل ہو جاتے۔''

لوگ مشفق خواجہ کے نشہ آور کالموں کے اس درجہ عادی ہو چکے تھے کہ ان کے نہ پڑھنے سے جسم ٹوٹنے اور دل پر بے زاری کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بند ہونے پر لوگ کافی عرصے تک بے چینی کی کیفیت میں مبتلا رہے اور شدت سے ان کی کمی محسوس کرتے رہے۔

ان کاموں کے چند جملوں سے آپ بھی لطف اُٹھائیے۔

1۔ وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی میں اختلافات نہیں ہیں۔ یہ نورا کشتی ہے۔

2۔ موجودہ دور میں قصیدہ گوئی تنقید کی صورت میں زندہ ہے۔

3۔ کشور ناہید اٹامک انرجی کمیشن کی چیئرمین بھی بن سکتی ہیں۔

4۔ سادے صفحے لکھے ہوئے صفحوں سے زیادہ بامعنی ہوتے ہیں۔

5۔ غالب اختر الایمان کے مشورے پر عمل کرتا تو بڑا شاعر ہوتا۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ مشفق خواجہ بنیادی طور پر نقاد اور محقق تھے۔ جب کہ وہ محقق کو اپنے اندر کے مزاح نگار کی نظر سے دیکھتے ہیں تو بے ساختہ لبوں پر مسکراہٹ کے پھول کھل اُٹھتے ہیں۔

"ہم نے آج تک کسی محقق کے چہرے پر مسکراہٹ اور ہاتھوں میں کوئی معقول کتاب نہیں دیکھی۔"

وہ محققین کو اس خوب صورتی سے مزاح کی زد پر لاتے ہیں کہ محققین کے رنجیدہ اور سنجیدہ چہروں پر بھی مسکراہٹ کی قوسِ قزح بکھر جاتی ہے۔

"ایک فی صد شاعر آنے والی نسلوں کے لئے شعر کہتے ہیں، باقی ننانوے فیصد آنے والے محققوں کے لئے۔"

"محققوں کو زندہ ادیبوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی او' جوں ہی کسی ادیب کا انتقال ہوتا ہے اس کے حالات جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں۔"

مشفق خواجہ کے طنز و مزاح کے جملے اتنے پر لطف اور نوکیلے ہوتے ہیں کہ دِل کو مسلسل گدگداتے، نظر کو گرماتے اور دماغ کو برماتے رہتے ہیں اور جن کے متعلق وہ لکھے گئے ہیں ان کے دماغ کو برماتے رہتے ہیں۔ گدگدانے، گرمانے اور برمانے کی

اس کیفیت کے عقب میں ادیب کی نفسیات ادبی معاشرے کی ناہمواری اور لفظوں کی خوبصورت پیوند کاری ہوتی ہے۔

1۔ انہوں نے جس تیزی سے شہرت حاصل کی ہے اتنی تیزی سے کوئی رسوائی بھی حاصل نہیں کرتا۔

2۔ میر کو دل کا خریدار نہیں ملتا تھا۔آج کل کے شاعروں کو کتاب کا خریدار نہیں ملتا۔

3۔ ہمارے ملک میں مصنف ختم ہو جاتا ہے۔اس کی کتاب کا پہلا ایڈیشن ختم نہیں ہوتا۔

4۔ وہ دنیادار صوفی ہے۔اس کی ایک ہتھیلی پر تصوف ہے دوسری پر دنیا۔

5۔ غالب اور ناصر زیدی ایک ہی جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔بس ذرا لفظوں کی ترتیب مختلف ہوتی ہے۔

بطور محقق مشفق خواجہ کا مرتبہ بلند ہے۔ان کے مزاج میں تحقیق وجستجو اور تجسس کا مادہ وافر مقدار میں موجود تھا۔انہوں نے اُردو کے قدیم سرمائے کی تحقیق جس لگن، محنت اور دل جمعی سے کی ہے وہ قابلِ تعریف بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ ان کا پہلا تحقیقی کارنامہ ''تذکرہ خوش معرکۂ زیبا'' ہے جو 1848ء میں سعادت خان ناصر نے مرتب کیا تھا۔جن چار مخطوطوں کا سراغ لگایا گیا ہے۔مشفق خواجہ نے ''تذکرہ خوش معرکۂ زیبا'' کے مقدمے میں ان چاروں مخطوطوں کی تفصیل کے علاوہ متون اور شعراء کی تعداد کا فرق بھی واضح کر دیا ہے۔شعراء کی تعداد ۸۲۳ بتائی گئی ہے۔یہ پانچواں تذکرہ تھا جو اردو میں لکھا گیا۔میر تقی اور سودا سے لیکر مؤلف سعادت خان ناصر تک تقریباً ایک صدی کے شعراء کا تذکرہ موجود ہے۔

مشفق خواجہ کا دوسرا تحقیقی کام جائزہ مخطوطات اردو ہے، اس کتاب کا یہ وصف ہے کہ اگر آپ کسی شاعر پر کام کرنا چاہتے ہیں تو یہ کتاب بتائے گی کہ اس شاعر کے دیوان کے کتنے قلمی نسخے ہیں، کتنے ایڈیشن اشاعت پذیر ہیں، کتنے شائع ہو چکے

ہیں۔ ابتداء سے اب تک جتنے مضامین اس پر لکھے گئے ہیں سب کی تفصیل آپ کو مل جائے گی۔ مشفق خواجہ کا یہ منصوبہ دس جلدوں پر مشتمل تھا مگر افسوس موت نے اس کو مکمل کرنے کی مہلت نہ دی۔

مشفق خواجہ کی کتاب ''غالب اور صفیر بلگرامی'' بھی عمدہ تحقیقی کتاب ہے، صفیر بلگرامی غالب کے شاگردوں میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ خواجہ صاحب کی اس کتاب سے غالب اور صفیر بلگرامی کے تعلقات کی پوری تفصیل سامنے آجاتی ہے۔ بقول مالک رام ''غالب اور بلگرامی کے ذریعے کئی چیزیں پہلی مرتبہ منظر عام پر آئی ہیں۔''

مشفق خواجہ کا ایک تحقیقی کارنامہ ''اقبال از احمد دین'' ہے۔ یہ کتاب مولوی احمد دین نے ان کی زندگی میں شائع کر دی تھی۔ اقبال کی شخصیت اور فن پر اردو میں چھپنے والی یہ پہلی کتاب ہے، قبل از اشاعت ہی اقبال نے اس کاوش کو پسند نہیں کیا تھا۔ اس میں اقبال کی بعض طویل نظمیں شامل تھیں۔ ان دنوں اقبال اپنا مجموعہ کلام ''بانگ درا'' مرتب کر رہے تھے۔ اس کتاب کی اشاعت سے ''بانگ درا'' کی اشاعت پر منفی اثر پڑتا، احمد دین کا شمار اقبال کے دوستوں اور مداحوں میں ہوتا تھا، چناں چہ انہوں نے اس کتاب کے تمام نسخے نذر آتش کر دیئے (جب اقبال کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انہیں بہت دکھ ہوا) مگر حسن اتفاق سے پہلے ایڈیشن کے دو نسخے ضائع ہونے سے بچ گئے اور ان کے خاندان کے پاس محفوظ رہے تاہم تین سال کے بعد ۱۹۲۶ء میں کچھ ترمیم کے ساتھ دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا۔ مشفق خواجہ نے ان دونوں ایڈیشنوں کو سامنے رکھ کر ایک نسخہ تیار کیا جس میں طبع اول اور دوم کا پورا متن موجود ہے، یہ نسخہ ۱۹۸۹ء میں انجمن ترقی اردو کراچی نے شائع کیا تھا۔

مشفق خواجہ کی ایک غیر مدون کتاب ''پرانے شاعر، نیا کلام'' ہے۔ اس کتاب میں قدیم شعراء کے کلام سے ایسے اشعار کا انتخاب کیا گیا جو آج بھی پسند کیے جا سکیں۔

مشفق خواجہ کی آخری تحقیقی کتاب میرزا یاس یگانہ چنگیزی پر ہے۔ خواجہ صاحب کی تحقیق نے غالب شکن یاس یگانہ چنگیزی پر وقت کی پڑی ہوئی اس تمام دھول کو ہٹا کر ان کے نام اور کام کو اس انداز سے نمایاں کیا ہے کہ ان کا فن اور شخصیت نکھری نکھری نظر آنے لگی، ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ یگانہ کی یہ خوش قسمتی ہے کہ وفات کے طویل عرصے بعد انہیں مشفق خواجہ جیسا قدر دان میسر آ گیا۔ اس کتاب میں متن کی تصحیح کے ساتھ یگانہ کی فرہنگ بھی پیش کر دی گئی ہے۔ اس طرح ان گنت الفاظ از سر نو دریافت ہوئے ہیں۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں یگانہ کے تمام مطبوعہ، غیر مطبوعہ، مدون اور غیر مدون کلام کو تحقیقی صحت کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔ آئندہ یگانہ پر جو کام بھی ہوگا بنیادی ماخذ یہ کتاب ہوگی۔

تحقیق جیسے خشک علاقے کی سیاحت کے بعد اب ہم اس جزیرے کے شاداب علاقے ''مشفق خواجہ کی غزل'' کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اعلیٰ پائے کے نقاد اور محقق اچھے شاعر ثابت نہیں ہوتے مگر یہ کلیہ مشفق خواجہ کی غزل پر صادق نہیں آتا، ان کے تحقیقی کام کی وجہ سے ان کی غزل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، ۱۹۷۸ء میں ان کا مجموعہ غزل ابیات شائع ہوا تو اسے ایک نادر ادبی تحفہ شمار کیا گیا۔ وہ کاغذ، قلم لے کر شعوری طور پر شعر نہیں کہتے تھے بلکہ ان پر اشعار خود بخود نازل ہوتے تھے۔ تحقیقی کام کرتے کرتے اچانک زبان پر شعر آ جاتا تھا۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

''شاعری ان کے اندر کی آواز ہے اور یہ اس وقت باہر نکلتی ہے جب مضمون پک کر ثمرِ شیریں کی طرح خود بخود درخت سے گرنے کے لیے تیار ہو''

مشفق خواجہ اس شخص کے انتظار میں ہیں جس کی یادوں نے ان کے مکان کو مہکا رکھا ہے، انہیں دروازے پر دستک محسوس ہوتی ہے تو وہ جا کر دیکھتے ہیں تو ان کی ملاقات اپنے آپ سے ہو جاتی ہے۔

انہیں اپنے مکان میں ہونے کے باوجود بھی مکان اس لیے خالی محسوس ہوتا ہے کہ مکان کو اپنی یادوں کی خوشبو سے مہکانے والے شخص کی وہ شدت سے کمی محسوس کرتے ہیں، اس شخص سے ان کی قلبی وابستگی اتنی گہری اور پرانی ہے کہ بے شمار چہروں سے تعلق ہونے کے باوجود بھی اس شخص کی یادیں عمر بھر ان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔

کتنے چہرے تھے کہ تھا جن سے تعلق اپنا
یاد آیا ہے مگر زندگی بھر ایک ہی شخص

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ مشفق خواجہ کی شاعری میں دوسری علامت سفر کی ہے، یہ سفر مکانی کم اور ذہنی زیادہ ہے، وہ زمینی سفر کرنے کی بجائے اپنے اندر کی دنیا کا سفر زیادہ پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کی غزلوں میں رواں درد اور خستگی کی روقاری کے دل کی طرف سفر کرنے لگتی ہے۔

ایک ایسا شخص بھی دائم سفر میں رہتا ہے
جو قید اپنے ہی دیوار و در میں رہتا ہے

مشفق کی غزلوں کی لمبی بحریں مترنم اور رواں ہوتی ہیں۔ ان بحروں میں یادوں کے ویرانے، اُداسیوں کے سناٹے اور اندرونی کیفیت کا اظہار ملتا ہے جو انہیں خدائے سخن میر کے قریب کر دیتا ہے۔ دو اشعار ملاحظہ کیجئے:

جن جھوٹے سچے خوابوں کی تعبیر غم تنہائی ہے
ان جھوٹے سچے خوابوں سے تم کب تک دل بہلاؤ گے
ان دیدہ و دل کی راہوں پر تم کس کی تلاش میں پھرتے ہو
جو کھونا تھا، سو کھو بیٹھے، کیا ڈھونڈو گے، کیا پاؤ گے

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

"مشفق خواجہ غم سے مغلوب نہیں ہوتے بل کہ اس کی دل داری کرتے

ہیں۔ وہ نہ تو غم خواروں کو قریب آنے دیتے ہیں اور نہ ہی شکوۂ ناکامی کرتے ہیں۔ یہ شیوہ غالب کا بھی تھا۔ اب مشفق خواجہ کا ہے۔"

غم ہی لے دے کہ مری دولتِ بیدار نہیں
یہ خوشی بھی ہے میسر، کوئی غم خوار نہیں

ڈاکٹر انور سدید کا یہ نیا جزیرہ رقبے کے لحاظ سے چھوٹا ضرور ہے مگر اس کے مناظر، مقامات اور اشیاء میں اتنا تنوع، رنگارنگی اور گونا گونی ہے کہ دامن دل ان کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں مشفق خواجہ کی شخصیت اور فن کے تمام گوشوں کو ہائی لائٹ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ کتاب تحریر کرتے ہوئے انہوں نے اسلوب کی خوب صورتی کی طرف خاصی توجہ دی ہے۔ اس کتاب میں ایسے متعدد جملے مل جاتے ہیں جن کو پڑھ کر دماغ کو بالیدگی، دل کو فرحت افزا خنکی اور نظر کو کشادگی حاصل ہوتی ہے۔ اُمید ہے کہ مشفق خواجہ پر تحریر کی گئی یہ کتاب باذوق اور صاحب نظر قارئین میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور خواجہ صاحب پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے والوں کے لئے چراغِ راہ ثابت ہوگی۔

............☆☆............

''وقت اے وقت'' اور جمیل آذر

وہ اصناف جو تیز رفتار وقت کا ساتھ نہیں دے پاتیں (شطرنج کے پٹے ہوئے مہروں کی طرح) بساطِ ادب سے باہر ہو جاتی ہیں۔ ماضی میں قصیدہ جو شہنشاہوں کے درباروں سے وابستہ تھا، ان کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔ مگر اس کی پسلی سے جنم لینے والی غزل (ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے انشائیہ ''غزل'' میں ایک جگہ تحریر کیا ہے: ''غزل نے قصیدے کی پسلی سے جنم لیا ہے'') نے شہنشاہوں کے درباروں سے ناتا توڑ کر رومان سے اپنا رشتہ جوڑ لیا تھا۔ اس لئے وہ آج بھی شہرت کی بلندیوں پر پرواز کر رہی ہے۔ اپنے ایجاز و اختصار کی وجہ سے زمانہ کی تیز رفتاری، سائنس اور ٹیکنالوجی کی حیرت افزا ایجادات بھی اس کی مقبولیت کو کم نہ کر سکیں۔ جبکہ ماضی کی مقبولِ عام صنف داستان اپنے بھاری بھرکم وجود کی وجہ سے زمانے کی تیز رفتاری کا ساتھ نہ دے سکی اور ہانپنے لگی تو رواں دواں زمانے نے اسے بھی بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ اسی طرح چند اور اصناف بھی ماضی میں جن کا طوطی بولتا تھا، آج منقار زیر پر ہیں۔ اسی خلاء کو پورا کرنے کے لئے چند نئی اصناف اُردو ادب میں در آئیں۔

''دوسری بہت سی اصناف کی طرح انشائیہ بھی اُردو ادب میں مغرب سے آیا ہے۔ ویسے تو سر سید احمد خان، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد اور بہت سے جید ادباء کی تحریروں میں انشائی رویئے اور طرز فکر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں مگر اسے باقاعدہ ایک صنف کی حیثیت عطا کرنے والے بابائے انشائیہ ڈاکٹر و

زیر آغا صاحب ہیں۔ انہوں نے شب و روز کی کاوشوں سے اس نو خیز صنف کا اردو ادب سے تعارف بھی کرایا اور اسے رواج بھی دیا۔ ان کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ ''خیال پارے'' 1961ء میں کتابت و طباعت کے مراحل طے کر کے منظر عام پر آیا تھا۔ 1963ء میں ''اوراق'' جاری ہوا تو مشتاق قمر مرحوم کا انشائیہ ''چھتری'' اور پروفیسر جمیل آذر کا انشائیہ ''پکنک''، ''اوراق'' کے پہلے شمارے کی زینت بنے۔ جمیل آذر اس دور سے انشائیہ تخلیق کر رہے ہیں جب بیشتر ادیب اس کے نام سے بھی آشنا نہیں تھے۔ ان کا شمار انشائیہ کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ بقول اکبر حمیدی: ''جمیل آذر انشائیے کا رن جیتنے والے لشکر کے اوّل دستے میں بہت پیش پیش رہے ہیں۔''

جمیل آذر کی ولادت 30 جون 1930ء میں انبالہ (بھارت) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی۔ ایم۔ اے انگلش اور ایم۔ اے اُردو پنجاب یونیورسٹی لاہور سے کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد تدریس کے پیشے سے وابستہ ہو گئے اور گورنمنٹ کالج اصغر مال روڈ راولپنڈی سے ریٹائر ہو گئے۔ جمیل آذر کے مشاغل ادب، تنقید و تحقیق، سیاسیات، مذہب اور تصوف ہے۔ خاص طور پر مذہب سے انہیں زیادہ لگاؤ ہے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انہوں نے اپنے رخشِ خیال کی باگ پورے طور پر ادب اور مذہب کی طرف موڑ دی۔ اب ان کا زیادہ وقت ادب تخلیق کرنے اور عبادت میں گزرتا ہے۔

''وقت اے وقت'' ان کے انشائیوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے انشائیوں کے دو مجموعے ''شاخِ زیتون'' اور ''رت کے مہمان'' منصۂ شہود پر آ چکے ہیں۔ انہوں نے صرف انشائیے ہی تحریر نہیں کیے ہیں، انشائیہ پر

تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ان کی انشائیوں پر تنقیدی کتاب ''انشائیہ اور انفرادی سوچ'' کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ادبی رسائل اور اخبارات میں اس پر مضامین بھی شائع ہوئے ہیں اور اسلام آباد میں اس کی رونمائی بھی بڑے اہتمام سے ہوئی۔جمیل آذر نے تنقید میں انشائی رویئے کو بھی دریافت کیا ہے۔ان کی کتاب ''انشائی تنقید'' زیر طبع ہے۔اُمید واثق ہے کہ وہ بھی ''انشائیہ اور انفرادی سوچ'' کی طرح انشائیہ کی تنقید میں خوش کن اضافہ ثابت ہوگی۔''

پروفیسر جمیل آذر نے اردو کے بہترین انشائیے بھی مرتب کیے ہیں۔انہوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کی منتخب نظموں اور منشایاد کے منتخب افسانوں کے انگریزی میں تراجم بھی کیے ہیں۔ان کے انگریزی زبان میں کیئے گئے تبصرے انگریزی اخبارات ''دی مسلم''، ''دی نیشن''، ''ڈان''، ''دی نیوز'' میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

جمیل آذر کے انشائیوں کے تیسرے مجموعے ''وقت اے وقت'' (Time O Time) میں بیس انشائیے شامل ہیں جس کا پیش لفظ ''جمیل آذر کے انشائیے'' اردو ادب کے فکرِ تازہ کے معروف افسانہ نگار منشایاد نے لکھا ہے۔اردو ادب میں انشائیہ کے بانی ڈاکٹر وزیر آغا اور افتخار عارف (صدر نشین اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد) نے فلیپ تحریر کیے ہیں۔کتاب میں جہاں جمیل آذر کے انشائیوں کی سرحد ختم ہوتی ہے اس کے بالکل متصل ڈاکٹر رشید امجد نے ''شاید میں برومائیڈ ہوں'' کا تجزیاتی جائزہ لیا ہے۔اس کے بعد ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش نے ''رت کے مہمان پر'' (اپنے ایک خط کے ذریعے) تبصرہ کیا ہے۔اہل فکرونظر کی آراء میں ممتاز مفتی ڈاکٹر وزیر آغا، امین راحت چغتائی، مشفق خواجہ، افتخار عارف، ڈاکٹر انور سدید، جوگندر پال، فتح محمد ملک، اکبر حمیدی، انجم

نیازی، رشید نثار، پروین طارق، ڈاکٹر طیب منیر، ناصر عباس نیز، عابد سیال اور عنبرین تبسم شاکر کے نام شامل ہیں۔ کتاب کے آخر پر مصنف کا تعارف درج ہے جس میں مصنف کی پیدائش، تعلیم، تعلیمی درس گاہیں جن میں تعلیم حاصل کی، پیشہ، ادب میں پہچان، مشاغل اور مصنف کی تصانیف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

جمیل آذر ایک ایسے ادیب ہیں جو سر تا قدم انشائیے کے عشق میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے انشائیے کے علاوہ کسی اور صنف کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ان کی تمام عمر انشائیے تخلیق کرنے اور انشائیہ فہمی کے بارے میں مضامین تحریر کرنے میں گزری ہے۔ وہ انگریزی ادب کے استاد رہے ہیں۔ ان کا انگریزی ادب کا مطالعہ بھی خاصا وسیع ہے۔ انہوں نے انگیزی انشائیے کا مطالعہ بھی نہایت عمیق نظر سے کیا ہے۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے انشائیوں پر انگریزی انشائیے کی چھاپ نہیں لگنے دی۔ وہ اپنے انشائیوں میں اپنی دھرتی کی تہذیب و ثقافت کو ہائی لائٹ کرتے ہیں۔ جمیل آذر اپنے انشائیے "تانگہ کلچر" میں رقم طراز ہیں:

"ٹیکسی کلچر نے ہمیں مہنگائی، غیر ملکی قرضے اور ماحولیاتی آلودگی ہی نہیں عطا کی بلکہ ہم سے خودی اور خود انحصاری کی دولت بھی چھین لی۔ "تانگہ کلچر" جہاں ہمیں عزت نفس کی خوشبو عطا کرتا ہے وہاں خود انحصاری کا حسن بھی بخشتا ہے۔ آپ ذرا "تانگہ کلچر" کو فروغ بخش کر تو دیکھیں کہ وہ گورا کلچر یہاں سے کس طرح رفو چکر ہوتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ کوچوان استاد منگو جیسا ہونا چاہیے۔"

جمیل آذر کے انشائیے جماعتی اور معاشرتی خیال کے قالب کو (جو مقبول عام ہوتے ہیں) قبول نہیں کرتے۔ جب وہ اجتماعی سوچ کی فرسودہ اور پیش پا افتادہ پرتوں کو اُتار کر اشیا یا مظاہر کے اندر جھانکتے ہیں تو وہاں ایک نیا جہان معنی ان کے استقبال کے

لئے موجود ہوتا ہے۔ جس سے وہ خود بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور قاری کو بھی اس بہجت میں شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ عام لوگوں کی نظر میں گھر اور مکان میں کوئی فرق نہیں ہوتا، ان کے نزدیک گھر اور مکان دونوں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ جمیل آذر گھر اور مکان کے درمیان جو فرق دکھاتے ہیں عام قاری کی وہاں تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ انشائیہ ''ہوم سویٹ ہوم'' کا یہ اقتباس دیکھئے:

''مکان، غیر نامیاتی ہوتا ہے جبکہ گھر نمو پذیر۔ گھر کا تصور نہ صرف بہت باریک اور پراسرار ہے بلکہ ہمارے فہم سے ماورا بھی ہے۔ انسان عالمِ وجود میں آنے سے پہلے بھی گھر ہی میں رہتا ہے جو عالمِ بالا میں ہے۔ اس جہانِ رنگ و بو میں اس کا پہلا گھر رحم مادر ہے، پھر ماں کی گود اور اس کی شفقت اور محبت کی خوشبو۔ پھر جب وہ شعور کی آنکھ کھولتا ہے تو اس کا اپنا ماحول اور اپنی ثقافت و تہذیب اور اپنی دھرتی کی فضا اور بعد ازاں یقین و ایمان کا نور جو لفظ و رنگ اور سنگ و خشت کی تجسیم سے ماورا ہے۔ پھر یہی گھر بعد از حیات ارضی بھی اس کا استقبال کرتا ہے''۔

اس اقتباس میں گھر کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو عام لوگوں کی گرفت میں نہیں آتے۔ ان کے خیال کے مطابق ایک تو وہ گھر ہے جسے ہم مکان کہتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ انسان کے اس دنیا میں وارد ہونے سے پہلے عالمِ بالا میں بھی انسان کا گھر ہے جہاں وہ رہتا تھا۔ آب و گل کی اس دنیا میں آنے سے قبل شکم مادر بھی اس کا گھر ہوتا ہے۔ یقین و ایمان کا نور بھی انسان کا گھر ہے۔ لحد بھی انسان کا گھر ہے جہاں قیامت تک اس کا قیام ہوتا ہے۔ بعد ازاں وہ اپنے ابدی گھر میں منتقل ہو جاتا ہے۔ جمیل آذر کی ژوف بینی اور فعال ذہن نے ان گھروں کی نشان دہی کی ہے جو ہماری نظروں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی دبیز دھند کی تہ میں پوشیدہ ہیں۔

جمیل آذر کو مذہب سے گہرا لگاؤ ہے اس لئے ان کے انشائیوں میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے انشائیے ''سفر'' کے عنوان سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ انشائیہ مسافرت یا سیاحت پر تحریر کیا ہوگا۔ انشائیہ پڑھنے سے پہلے ہمارے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ دیکھیئے وہ ہمیں کس دیس کی سیر کرواتے ہیں مگر اس کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زمینی یا ہوائی سفر پر انشائیہ تحریر نہیں کیا بلکہ انہوں نے روحانی سفر کا تذکرہ کیا ہے جس میں شروع سے آخر تک ماہِ رمضان اور روزوں کا ذکر نئے انداز میں کیا ہے۔ کبھی تو سحری میں اپنے پوتے کو اپنے پہلو میں بیٹھا دیکھ کر ان کا توسنِ خیال ماضی کے اس دور میں پہنچ جاتا ہے جب وہ اپنے پوتے کی طرح خود آنکھیں ملتے ہوئے گھر کے کسی بزرگ کے پہلو میں جا بیٹھتے تھے، ان کے اس انشائیے میں سحری سے افطاری تک کے سفر کا ذکر خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔

''یوں سحر سے افطاری تک کا سفر ثقافتی اعتبار سے میٹھے سے نمک تک کا سفر ہے جو بھوک اور عشق و سرمستی کے مراحل طے کرتا ہوا عید کی جانفزا منزل پر پہنچتا ہے۔ اصلاً ہر افطاری عید سعید کے مماثل ہے جہاں ہر طرف خوشیوں کی بہار پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔''

ویسے تو ہر صنف ادب کے پس پردہ تخلیق کار کی ذات موجود ہوتی ہے مگر انشائیے میں دوسری اصناف کی نسبت زیادہ مواقع میسر آتے ہیں۔ انسان کی ذات اس عمیق سمندر کی مانند ہے جس کی گہرائی کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ انسان کا اپنی ذات تک رسائی حاصل کرنا سہل نہیں ہے۔ جمیل آذر کا اپنے انشائیہ ''شاید میں برو مائیڈ ہوں'' میں بلدیہ کے جدید ترین، خوبصورت اور کشادہ پارک (جہاں نہایت سلیقے اور قرینے سے قطار اندر قطار درخت لگے ہوئے ہیں) کو چھوڑ کر زرعی فارم کے دھول اڑاتے ہوئے کچے راستوں پر صبح کی سیر کرنا انہیں اس لئے پسند ہے کہ وہ دیہاتی زندگی

کی علامت ہے۔ دیہاتی مناظر فطرت کے زائیدہ ہوتے ہیں۔ شہر کی مصنوعی اور مشینی زندگی سے ناطہ توڑ کر فطرت کی رعنائیوں سے تعلق جوڑنا اپنی ذات کے انکشاف کا ایک ذریعہ ہے جس سے جمیل آذر پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اندر غواصی کر کے انمول موتی باہر لا کر اپنے انشائیے کی شال میں ٹانک دیتے ہیں۔

جمیل آذر کے انشائیے ''شاید میں برومائیڈ ہوں'' کی چند سطور ملاحظہ کیجئے:

''اس دیہاتی پس منظر میں مجھے ایسا لگتا ہے کہ فطرت ہر لمحہ اور ہر آن نئے مناظر رقم کرتی ہے۔ یکسانیت اور جمود کی چادر کو تار تار کر کے تحرک اور تبدیلی کے نئے نئے پیرہن اوڑھ کر ہمیں لطف و سرور سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ تنہائی، سکون، عافیت اور احساسِ تحفظ کی دولت سے مالا مال کرتی ہے اور غور و فکر کے وافر مواقع عطا کرتی ہے۔''

دعوتِ ولیمہ اتنی عام ہے کہ ہمارے اردگرد کہیں نہ کہیں اس کا انعقاد ہوتا رہتا ہے اور لوگ بڑے شوق سے اس میں شرکت کرتے ہیں۔ جمیل آذر کسی دعوتِ ولیمہ میں شریک ہوتے ہیں تو ان کی نظریں لذیذ کھانوں کی بجائے کھانا کھاتے لوگوں پر مرکوز ہوتی ہیں۔ جب اکثر لوگ تہذیبی شعور کو طاق پر رکھ کر سرتا قدم لاشعور کے زیرِ اثر آ جاتے ہیں تو وہ منظر دیدنی ہوتا ہے مگر اسے انشائیے کا روپ جمیل آذر جیسا حساس اور کہنہ مشق انشائیہ نگار ہی دے سکتا ہے۔ وہ اپنے انشائیے ''دعوتِ ولیمہ'' میں رقم طراز ہیں:

''اس جشن طعام کا ایک دلچسپ ثقافتی پہلو یہ بھی ہے کہ آپ یہاں تہذیب کی کیچلی اُتار کر خود کو آزاد کر لیتے ہیں اور شعوری زندگی کو لحظہ بھر کے لئے ترک کر کے اپنے آپ کو کھلا چھوڑ کر لاشعور کی دنیا میں چلے جاتے ہیں جہاں تہذیبی شعور آپ کے اور لاشعور کے درمیان دیوار بن کر حائل نہیں ہوتا۔ آپ مکمل طور پر آزاد ہوتے ہیں۔ آزادی کے یہی چند لمحات ہیں جو دعوتِ ولیمہ آپ کو

عطا کرتی ہے۔"

اُمید کامل ہے کہ جمیل آذر کا مجموعہ "وقت اے وقت" (Time O . Time) اردو ادب کے قارئین میں عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور انشائیہ نگاری کی تاریخ میں قابلِ تعریف اضافہ ثابت ہوگا۔

............☆☆............

انشائی تنقید اور جمیل آذر

پروفیسر جمیل آذر کا شمار اردو انشائیہ کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ''اوراق'' کے پہلے شمارے میں مشتاق قمر مرحوم اور جمیل آذر کے انشائیے شائع ہوئے تھے۔ ان کا تعلق انشائیہ کے ہراول دستے سے ہے۔ اس صنف سے انہیں اس قدر لگاؤ اور وابستگی ہے کہ انہوں نے ساری عمر کسی دوسری صنف کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ انشائیے نے ان کی اس وابستگی، شیفتگی اور وارفتگی کو دیکھتے ہوئے انہیں اس مسندِ فراز پر بٹھا دیا کہ ان کے ذکر کے بغیر انشائیہ خود کو ادھورا اور نا تمام محسوس کرتا ہے۔ یہ جمیل آذر کی انشائیے کے ساتھ محبت کا واضح ثبوت ہے کہ وہ انشائی تنقید کے تعارف نگار اور علم بردار بھی ہیں۔ ان پر انشائی تنقید لکھنے کا انکشاف PAULO COELKِ کے ناول ALCHEMIST کے دیباچے کی قرأت کے دوران ہوا تھا جس کا ذکر انہوں نے اپنے مضمون انشائی تنقید، جھیل اور افاسی سس کے پہلے جملے میں کیا ہے۔ بعد ازاں ان کو اس CONCEPT نے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔ پہلے ان کے چند مضامین مختلف ادبی رسائل کی زینت بنے اور حال ہی میں ان کے مضامین ''انشائی تنقید'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے انشائی تنقید کی شعریات اور مبادیات پر انشائی انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا ان کی انشائی

تنقید کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

''ان تینوں اسالیب سے ہٹ کر تخلیقی اسلوب ہے جو ایک تو کفایت لفظی کے تابع ہے۔ دوسرے بات سادہ اور تازہ انداز میں کرتا ہے۔ تیسرے جہاں ضرورت پڑے مثال اور تمثیل کو اس خوبی سے استعمال کرتا ہے کہ نہ صرف بات آئینہ ہو جاتی ہے بلکہ قاری تخلیقی سطح پر بھی لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پروفیسر جمیل آذر نے اسی وضع کے تخلیقی اسلوب کی حامل تنقید کو انشائی تنقید کا نام دیا ہے۔''

جمیل آذر نے اس کتاب کے ایک باب میں تخلیقی اور غیر تخلیقی اسلوب تنقید کا فرق مختلف نقادوں اور تخلیق کاروں کی تحریروں کی روشنی میں اتنی عمدگی سے بیان کیا ہے کہ تخلیقی اور غیر تخلیقی اسلوب کا فرق ذہنی جمناسٹک کے بغیر ہی قاری کے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

انشائی نقاد تنگ نظر ہوتا ہے نہ کوتاہ اندیش، نظریہ پرست ہوتا ہے نہ متعصب، وہ کسی منشور کے تابع ہوتا ہے نہ مبلغ، وہ تو آزادہ روی، کشادہ دلی اور فراخ حوصلگی کو فروغ دیتا ہے اور اپنے دلنشین اسلوب، تازگی فکر اور کشادہ نظری سے مسرت وانبساط کے پھول کھلاتا ہے۔ جن کی بھینی بھینی خوشبو اور فرحت بخش رنگ قاری کو دل کی کشادگی، نظری رفعت اور فکری بالیدگی عطا کرتی ہے۔ انشائی نقاد کا انداز بیان شگفتہ ہونے کے ساتھ ساتھ مدلل بھی ہوتا ہے۔

ابھی تک تو انشائی تنقید کے علم بردار اور تعارف نگار پروفیسر جمیل آذر ہی ہیں۔ وہ تن تنہا انشائی تنقید کو اردو ادب میں متعارف کروانے میں اپنی تمام تر ذہنی صلاحیتیں اور جسمانی قوتیں صرف کر رہے ہیں۔ اگر وہ اسی محنت، لگن اور جستجو سے انشائی تنقید کو رواج دیتے رہے تو امید ہے کہ ان کی یہ کاوش ایک روز ضرور رنگ لائے گی اور ان کے اس سفر

میں آہستہ آہستہ دوسرے لوگ بھی شامل ہو جائیں گے اور کارواں بن جائے گا۔ فرد واحد سے کارواں بننے کا یہ عمل اتنا آسان نہیں ہے۔ اس میں بڑے حوصلے، صبر اور استقامت کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ انہیں لوگوں کے اعتراضات کی پروا کیے بغیر انشائی تنقید کے پودے کی آبیاری اور نگہداشت اسی طرح کرتے رہنا چاہئے۔ جب یہ ننھا اور نازک پودا تناور درخت بن جائے گا تو پھر اعتراضات اور نکتہ چینی کے تند و تیز طوفانوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔

ڈاکٹر انور سدید ''انشائی تنقید'' کے بارے میں شش ماہی ''سمبل'' میں لکھتے ہیں۔

''فی الحال وہی (جمیل آذر) اس کے وکیل اور صنف ہیں۔ اس لئے انہیں اسی موضوع پر مزید مضامین لکھنا چاہئیں تا کہ دھند کے سفر میں روشنی کی واضح لکیر نمودار ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ اس روشنی میں کتنے لوگ سفر کر رہے ہیں''۔

مجید امجد کی نظموں میں ہنگامی جوش و خروش ہوتا تھا نہ نعرہ بازی، گھن گرج ہوتی تھی نہ شکوہ لفظی۔ وہ اپنے اندر کی گہرائیوں میں اتر کر ان جہانوں کا مشاہدہ و مطالعہ کرتے تھے جو خارجی دنیا سے بالکل مختلف ہوتے ہیں اور اپنے اندر گہرے اسرار و حقائق سموئے ہوئے ہوتے ہیں۔ جمیل آذر اپنے ایک مضمون ''انشائی تنقیدی رویہ'' میں مجید امجد پر ڈاکٹر وزیر آغاز کے ایک مضمون کا اقتباس درج کرتے ہیں۔ جس میں بے ساختگی بھی ہے اور برجستگی بھی، خوبصورتی بھی ہے اور تخلیقی چمک بھی۔

''مجید امجد نے ذات اور کائنات کی سیاحت کا آغاز کیا۔ وہ ذات کے اندر کے جہان کی ان تہوں تک پہنچا جن کو چھو کر تخیل کے پر بھی جل اٹھیں۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ کائنات کے اس بے نہایت پھیلاؤ میں بھی دور دور تک اڑا

جس کا ادراک ایک شاعر ہی کر سکتا ہے۔ جس کا تخیل زرخیز، نظر وسیع اور جس
کی تخلیقی لپک بے پایاں ہوتی ہے۔"

منٹو اور اخلاقی اقدار اس کتاب کا ایک ایسا مضمون ہے۔ جس میں علمیت کا رعب ہے نہ بھاری بھرکم الفاظ کی بھرمار، بوجھل علمی اصطلاحات ہیں نہ ثقیل اور عسیر الفہم تشبیہات و استعارات، مضمون کی عبارت کسی خوش خرام ندی کی طرح نہایت ہمواری سے بہے جا رہی ہے۔ کہیں بھی ابلاغ کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا اور تمام مضمون آئینہ ہو جاتا ہے۔

"منٹو کے نزدیک اخلاقی قدریں ایک نئے زاویۂ فکر سے ہمارے
سامنے آتی ہیں۔ یہ وہ عالم گیر قدریں ہیں جو تمام انسانیت کو اپنے تصرف میں
لئے ہوئے ہیں۔ منٹو بڑی بے باکی اور دراکی سے تمام مروجہ مصنوعی قدروں
کے کھوکھلے پن کا پردہ چاک کر کے حقیقی انسانی قدروں کو فن کارانہ طور پر پیش
کرتا ہے۔"

جمیل آذر کے ایک مضمون کا عنوان ہے "سرِ شام سے پس حرف تک" جو ضیاء جالندھری کے چار شعری مجموعوں کی کلیات ہے۔ ضیاء جالندھری کا شمار جدید نظم کے اہم شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ نسوانی حسن کے دلدادہ بھی ہیں اور حسن فطرت کے پرستار بھی۔ فطرت کے سارے رنگ اور روپ ان کی شاعری میں نمایاں ہیں، جمیل آذر ان کی اس خوبی کو اتنی خوبصورتی سے لفظوں کی پوشاک پہناتے ہیں کہ چند سطور میں ضیاء کی شاعری کا یہ پہلو پورے آب و تاب سے ایک ایسا باب بن جاتا ہے۔ جس کے ذریعے ان کی شاعری کے محل میں داخل ہو کر جی بھر کر سیر کی جا سکتی ہے۔ جمیل آذر لکھتے ہیں۔

"مناظر فطرت ہوں یا ثقافتی مناظر، بسنت ہو یا برسات، صبح ہو یا شام ضیاء
ان تمام کیفیات سے نشاط سحر انگیز کشید کرتا ہے۔ محبت کے راگ الاپتا ہے اور
حسن و جمال کے دلفریب رنگ بکھیرتا ہے"۔

منشاء یاد اُردو افسانے کا ایک بڑا نام ہے۔ اُردو افسانے نے جو تین کروٹیں

بدلی ہیں۔ منشاء یاد کے افسانوں میں وہ موجود ہیں۔ وہ حال کے تقاضوں کا پورا پورا خیال بھی رکھتے ہیں اور ماضی کی روایات سے بھی جڑے رہتے ہیں۔ انہوں نے کئی شہکار افسانے تخلیق کیے ہیں۔ جمیل آذر نے منشاء یاد کے فن کے بارے میں اتنے رواں اور سلیس انداز میں مضمون تحریر کیا ہے کہ عام سا قاری بھی آسانی سے اس کی تفہیم کر سکتا ہے۔ مضمون کی چند سطور ملاحظہ کیجئے۔

''منشاء یاد مصلحت پسندی، منافقت، خودغرضی، لالچ، تکبر، رعونت جیسے انسانیت سوز عناصر خبیثہ کی نشاندہی کر کے انسانی روحِ فکر کو بیدار کرتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے اندر لگے غلاظتوں کے ڈھیر کو صاف کر کے جہد مسلسل میں مصروف عمل ہے۔ یوں منشاء کی سوچ مثبت اور صحت مند ہے''۔

وقار بن الٰہی کو افسانہ نگار اور خاکہ نگار کی حیثیت سے میں کافی عرصہ سے جانتا ہوں۔ مختلف ادبی رسائل میں ان کے افسانے زیادہ اور خاکے کم پڑھے اور لطف اندوز ہوا۔ ان کی آپ بیتی ''ماں میں تھک گیا ہوں'' کی شہرت مختلف رسائل و جرائد کے ذریعے مجھ تک پہنچی مگر بدقسمتی سے اب تک اس تک میری رسائی نہ ہوسکی۔ جمیل آذر کا مضمون پڑھنے کے بعد وقار کی زندگی کی تصویر کے مختلف روپ، رُخ اور رنگ میرے سامنے آئے ہیں۔ جمیل آذر کا یہ مضمون کفایت لفظی کی عمدہ مثال ہے۔ انہوں نے صرف چودہ صفحات میں اس طویل خودنوشت کو اس طرح سمیٹا ہے کہ ان کی زندگی کے تقریباً تمام اہم پہلو ہم پر آئینہ ہو گئے ہیں پروفیسر صاحب کا ایک جملہ دیکھئے جس میں بے ساختگی، برجستگی اور کفایت لفظی کا حسین امتزاج ہے۔

''یہاں تک کہ تھک ہار کر وہ نڈھال ہو گیا اور بے اختیار پکار اُٹھا ''ماں میں تھک گیا ہوں'' یہ ایک چیخ ہے جو اس کے حلق سے نکلی اور کتاب کی شکل میں ڈھل گئی''۔

سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں کا مجموعہ ''نام میں کیا رکھا ہے'' میں شامل

انشائیے آزاد ترنگ کے خوبصورت نمونے ہیں۔ وہ جب عمیق خیالات کو شگفتہ، لطیف اور رواں تحریر کے قالب میں ڈھالتے ہیں تو خوبصورت انشائیہ صفحۂ قرطاس پر چم چم کرنے لگتا ہے۔ جمیل آذر نے سلیم آغا کے انشائیوں پر تحریر کردہ مضمون میں انشائی تنقید کے ذریعے ان کے انشائیوں کا جائزہ لیا ہے۔ چند سطور ملاحظہ کیجئے۔

"غسل اور غسل خانے ویسے بھی انسان کے اندر تطہیر پیدا کرنے کی علامت ہیں اور انسان کے اندر توانائی اور تخلیقی صلاحتیں پیدا کرتے ہیں انسان کے اس بظاہر چھوٹے فعل کو انہوں نے تہذیب اور ثقافت کے کینوس پر گہری عرق ریزی کے ساتھ پھیلا کر نمایاں کیا ہے"۔

اس کتاب کی آخری تحریر "انمول تحفہ" انشائی رپورتاژ ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے گوہر جمیل کے ساتھ متحدہ عرب امارات اور عمان کی سرحد دبا (Dibba) کے قریب قبرستان کی زیارت کی ہے۔ جہاں صحابہ کرامؓ کی قبور ہیں۔ راستے میں انہوں نے ایک باغ سے کھجوریں خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا تو باغ کے مالک شیخ نے ڈھیر ساری کھجوریں تحفۃً دے دیں۔ جمیل آذر نے البدیا مسجد کی زیارت بھی کی تھی۔

پروفیسر جمیل آذر نے یہ تحریر اتنے خوبصورت انداز میں رقم کی ہے کہ قاری کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ان کے ساتھ سفر کر رہا ہو اور وہاں کے تمام مناظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔

بلاشبہ جمیل آذر کی یہ کتاب اُردو ادب میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔ جس کی تحریریں اتنی رواں دواں، سلیس اور صاف ہیں کہ ہمیں تنقیدی کتاب پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کوئی افسانوی مجموعہ پڑھ رہے ہوں۔

تو راہ نوردِ شوق ہے......

پروفیسر جمیل آذر کو کتاب ''راہ نوردِ شوق'' لکھنے کا خیال ملک کے معروف ناشر ملک مقبول احمد کی خودنوشت سوانح عمری ''سفر جاری ہے'' کو پڑھنے کے بعد آیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید نے بھی ان کے رخش خیال کو مہمیز کیا تھا۔ ڈاکٹر انور سدید نے انہیں ''سفر جاری ہے'' کا ایک نسخہ بھجوایا اور اس پر اظہار خیال کرنے کی دعوت دی۔ کتاب کے حسن نے ابتداء ہی میں انہیں اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے توں توں ان پر کتاب کا حسن واشگاف ہوتا گیا۔ کتاب کا رواں اور سلیس اسلوب اور دلچسپ واقعات سے بے حد متاثر ہوئے اور اس پر ایک مضمون تحریر کیا جسے ڈاکٹر صاحب نے بہت پسند کیا اور ''پذیرائی'' میں شامل کر لیا گیا۔ جس میں چھیاسی ادیبوں کے مضامین شامل ہیں۔

ملک مقبول احمد کی آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' نے جمیل آذر کو اس لئے بھی متاثر کیا کہ اس کا اسلوب انشائی ہے۔ ان کا شمار اردو انشائیہ کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ اسؒ کے علاوہ انشائی تنقید کے تعارف نگار اور علم بردار بھی ہیں۔ انشائی تنقید پر ان کے دو مضامین اشاعت پذیر ہیں۔ پہلا مضمون ''انشائی تنقیدی رویہ''، ''سمبل''، راولپنڈی میں اور دوسرا ''انشائی تنقید، جمیل اور نارسی سس'' کے عنوان سے ''الحمراء'' لاہور میں۔ ان دونوں مضامین میں انہوں نے انشائی تنقید کی مبادیات اور شعریات پر سیر حاصل روشنی

ڈالی ہے۔ جنہیں اہل ذوق نے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

پروفیسر جمیل آذر کو اس آپ بیتی نے اس لئے بھی متاثر کیا کہ ملک مقبول احمد کی زندگی کا ابتدائی دور دیہاتی ماحول میں بسر ہوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے دیہی ثقافت کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ جمیل آذر کی زندگی کے ابتدائی دور پر بھی دیہی ثقافت کی چھاپ بہت گہری ہے۔ ملک صاحب کی آپ بیتی کو پڑھتے ہوئے انہیں ایسے محسوس ہوا جیسے وہ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں پہنچ گئے ہوں۔ چنانچہ "راہ نوردِ شوق" میں ایک نہیں دو شخصیات کی آپ بیتیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ بالائی سطح پر ملک مقبول احمد کی اور زیریں سطح پر جمیل آذر کی۔ ان دونوں میں ایک قدر یہ بھی مشترک ہے کہ دونوں سلیف میڈ ہیں۔

ملک مقبول احمد کا تعلق سیالکوٹ کے ایک دیہات دیووال سے تھا۔ جہاں انہوں نے بچپن اور جوانی کا کچھ حصہ گزارا تھا۔ ان دونوں دیہاتوں میں ان کی ثقافت پورے عروج پر تھی۔ پرانی روایات نے ان دیہاتوں کو اپنے اندر پوری طرح ضم کر رکھا تھا۔ دیہاتی فضا چرخوں کی آوازوں، رنگین مدھانیوں کے مدھر شور، پازیبوں کی جھنکاروں، گیتوں، ماہیوں کی آوازوں سے گونجتی رہتی تھی۔ ملک مقبول احمد دیہات کے ان مناظر کو خوبصورت لفظوں کا جامہ پہنا کر یوں پیش کرتے ہیں۔

"موسم گرما میں صبح کے کام کاج سے فارغ ہو کر محلے کی کچھ عورتیں حویلی میں جمع ہو کر چرخا کاتتیں، کپاس بیلتیں، سرکنڈے اور کھجور کے رنگ برنگے پتوں سے موڑھے، ٹوکریاں، چنگیریں، چھابے اور جانے کیا کیا بناتیں۔"

ملک صاحب آگے چل کر بیان کرتے ہیں کہ ان عورتوں میں سریلا گلا رکھنے والی خواتین "معراج نامہ"، "ہیر وارث شاہ" اور "یوسف زلیخا" پڑھتیں۔ کبھی کبھی دوہوں کا مقابلہ بھی کرتیں۔ خوش الحان خواتین کی آوازیں ماحول کو سحر زدہ کر دیتی تھیں۔

جمیل آذر کا بچپن بھی دیہات میں گزرا تھا۔ چنانچہ وہ اس دیہاتی ماحول اور ثقافت سے آشنا بھی تھے اور متاثر بھی ''سفر جاری ہے'' کے مطالعہ کے دوران ان کا راہوارِ تخیل ماضی کی شاہراہ پر تیزی سے دوڑنے لگتا ہے اور وہ جلد ہی وہاں پہنچ جاتے ہیں جہاں بچپن اور لڑکپن کی یادوں کے پنچھی ماضی کے آسمان پر محوِ پرواز ہوتے ہیں۔

جمیل آذر رقم طراز ہیں کہ بچپن میں کھیل کود میں حصہ نہ لینے والا بچہ بیمار، جوانی میں حسن و عشق کی وادی میں قدم نہ رکھنے والا نوجوان نفسیاتی طور پر کنفیوزڈ ہوتا ہے اس نفسیاتی اصول کے آئینے میں ملک مقبول احمد کی شخصیت کا مشاہدہ کرتے ہیں تو وہ انہیں تینوں ادوار میں صحت مند دکھائی دیتے ہیں۔ ملک مقبول احمد اپنی آپ بیتی میں نہایت سادگی، سچائی اور معصومیت سے کہتے ہیں ''میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔ میں ہر خوبصورت لڑکی کو دل دے بیٹھتا تھا۔ خوبصورت اور دلکش شخصیت کے سامنے دل و دماغ پر قابو نہ رہتا تھا۔ میری کیفیت کچھ یوں ہو جاتی تھی۔

تیرے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

ملک صاحب کا خوبصورت شمی پر فریفتہ ہونا، بعد ازاں دو سگی بہنوں شہناز اور شمشاد کی محبت میں گرفتار ہو جانا۔ شہناز کے بچپن میں انتقال کر جانے اور شمشاد کے (اپنی مرضی کے خلاف) بیاہ کر دوسرے گاؤں میں چلے جانے کے بعد ان کی دونوں افلاطونی محبتیں اپنے انجام کو پہنچ گئیں۔ ان کی آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرؔ کی طرح دور سے حسن کا نظارہ کرنے والے شخص تھے۔ غالبؔ کی طرح دامن کو حریصانہ کھینچنے کی جرأت رندانہ کی ان میں کمی تھی۔

وہ لکھتے ہیں کہ ان کے بچپن کے زمانے میں خواتین دوسروں کے سامنے اپنے

شوہروں سے بھی پردہ اور حجاب کیا کرتی تھیں۔ گاؤں کے بچوں کے مشاغل شہری بچوں کے اشغال سے بالکل مختلف تھے۔ جوہڑوں اور نہروں میں نہانا، غوطے لگانا، بندروں کی طرح درختوں پر چڑھنا، پیڑوں کے تنوں پر بیٹھ کر گپ شپ کرنا، کچے پکے پھل توڑنا، کھیتوں سے گاجریں، مولیاں، تربوز اور خربوزے توڑ کر کھانا، آنکھ مچولی کھیلنا، کشتی، کبڈی اور دیگر کھیلوں میں حصہ لینا ان کے پسندیدہ مشاغل تھے۔ دیہاتوں میں میلے ٹھیلوں کا انعقاد، ریچھ اور بندر کے تماشے، مداری کا طوطے سے توپ چلوانا، آخر میں دست سوال دراز کرنا اور دیہاتیوں کا خوش ہو کر پیسے دینا، ناٹکوں میں ہیر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی مہینوال جیسے معروف زمانہ قصوں کا سوانگ بھرنا، نوعمر لڑکوں کا زنانہ لباس پہن کر، ہیروئن کا کردار ادا کرنا، نسوانی آوازوں میں گانے گا کر لوگوں کے لئے تفریح طبع کا سامان مہیا کرنا اور شائقین کا دل کھول کر ان پر روپے نچھاور کرنا اس دور میں بہت عام تھا۔

پروفیسر جمیل آذر کو ملک مقبول احمد کی سوانح عمری پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا ہے جیسے ملک صاحب نے ان کی آپ بیتی تحریر کی ہے۔ اس لئے تو انھوں نے ''سفر جاری ہے'' پر دو سو انسٹھ صفحات پر مشتمل کتاب ''راہ نوردِ شوق'' تحریر کی ہے۔ میرے خیال میں اس سے قبل کسی پبلشر نے اپنی آپ بیتی تحریر نہیں کی اور نہ ہی کسی نقاد نے کسی ایک سوانح عمری پر کوئی ضخیم کتاب لکھی ہے۔ ملک مقبول احمد نے اپنی آپ بیتی میں وہی کچھ لکھا ہے جو ان کی زندگی میں پیش آتا رہا ہے۔ انھوں نے نہ تو کچھ چھپانے کی کوشش کی ہے اور نہ ہی مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے۔ ان کی آپ بیتی کے مطالعہ سے ان کی ظاہری شخصیت سے بھی آگاہی ہوتی ہے اور ان کے باطنی جزیروں کی سیاحت کے مواقع بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ جن سے ہم حظ بھی اٹھاتے ہیں اور ان کے تجربات سے بہت کچھ سیکھتے بھی ہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر جمیل آذر لکھتے ہیں۔

''سفر جاری ہے'' ملک مقبول احمد کی ظاہری اور باطنی تصویر ہے۔ جس میں ان کی معصومیت کا حسن اپنا نور بکھیر رہا ہے۔ اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کے اندر کا بچہ بدستور زندہ و تابندہ ہے بچپن میں وہ اپنے گاؤں کے بچوں کے ساتھ کھیلتا تھا اور اب بڑھاپے میں اپنے پوتوں، پوتیوں اور نواسوں نواسیوں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ اپنی جیون کتھا میں وہ قاری کو بھی شاید یہی کہہ رہا ہے کہ ''بچپن کے دن بھلا نہ دینا''۔

ملک مقبول احمد کو اپنے بچپن کے دوستوں میں میر خلیل احمد اور گیان چند (جوانی کے کلاس فیلو بھی تھے) بہت یاد آتے ہیں۔ گیان چند اور وہ دونوں سکول سے اکٹھے بھاگا کرتے تھے اور بیری کے تنوں پر بیٹھ کر ڈھیروں باتیں کیا کرتے تھے۔ ملک صاحب کو بچپن میں بٹیر پالنے کا بھی شوق تھا۔ ملک صاحب کے دوستوں کے بارے میں پڑھتے ہوئے جمیل آذر کے ذہن میں ان کے بچپن کے دوست گردش کرنے لگتے ہیں جو میر خلیل اور گیان چند سے چنداں مختلف نہ تھے۔

ملک مقبول احمد نے دیہی کرداروں میں ماسٹر فیروز دین، چودھری مولا داد، میاں اللہ ماہی اور چودھری دسوندھی خان کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ ماسٹر فیروز دین کا شمار ایسے اساتذہ میں ہوتا تھا جو تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کی کردار سازی اور شخصیت سازی پر بھی پوری توجہ دیتے تھے۔ ملک صاحب کے دماغ پر جب امارت کے غرور کا نشہ چڑھنے لگا تو ایک روز ماسٹر فیروز دین نے ان سے کہا ''بیٹا اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے'' نرم لہجے میں کی گئی دانائی کی اس بات سے وہ بہت شرمندہ ہوئے اور ان کے غرور میں واضح کمی آگئی۔

دیہی کرداروں میں ایک خوبصورت کردار میاں اللہ ماہی کا ہے۔ (کرداروں

کے نام اپنے اندر وہی ثقافت کے اثرات لئے ہوئے ہوتے ہیں) اللہ ماہی ایک دکاندار تھا جس کی دکان سکول کے راستے میں تھی۔ وہ اپنی دکان بچوں کی چھٹی ہونے سے پانچ منٹ پہلے بند کر دیتا تھا۔ اس وقت دکان بند کرنے کی وجہ میاں اللہ ماہی کی زبان سنئے۔

"میاں صاحبزادے! تم ابھی اپنے شباب کے آغاز میں ہو جبکہ میری جوانی ڈھل چکی ہے۔ میری شادی ہوئی ہے نہ بچے ہیں اور ابھی کوئی ایسا نہیں جس سے میں دل کی باتیں کر سکوں...... مجھے بچے سکول میں آتے دیکھ کر بڑی تسکین ہوتی ہے...... ان کو جاتے دیکھ کر دکھ ہوتا ہے...... اسی لئے میں نے اپنی دکان کے اوقات ایسے رکھے ہیں کہ میں اداسی کے مناظر نہ دیکھ سکوں۔"

"سفر جاری ہے" میں ایک جاندار کردار چودھری دسوندھی خان کا ہے۔ وہ معروف گاؤں ورک کی قابل احترام شخصیت تھی۔ اس علاقے کے ذیلدار بھی تھے۔ بڑے سخی اور ہمدرد انسان تھے۔ نمود و نمائش سے پاک، ہر کام اللہ کی رضا کے لئے کرتے تھے۔ ایسے سب کردار تقریباً تمام دیہاتوں میں تھوڑی بہت کمی بیشی کے بعد موجود ہوتے ہیں۔ جمیل آذر کو بھی اپنے بچپن میں ایسے کرداروں سے ضرور واسطہ پڑا ہوگا۔ اگر وہ اپنی آپ بیتی تحریر کرتے تو اپنے بچپن میں دیکھے ہوئے ایسے چند کردار ضرور پیش کرتے۔

ملک مقبول احمد نے جے۔وی کی ٹریننگ 1950ء میں مکمل کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ بورڈ پرائمری سکول کلوئے ضلع سیالکوٹ میں استاد کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ وہ اپنی قابلیت اور بہترین انداز تعلیم کی وجہ سے طلباء میں ہر دلعزیز تھے۔ بعد ازاں اپنے والد کی خواہش پر گوجرانوالہ میں پٹوار سکول میں داخلہ لے لیا۔ پٹوار کا امتحان پاس کرنے کے بعد اپنے والد کے پرزور اصرار کے باوجود ملازمت نہ کی۔ ملازمت نہ کرنے کی دو وجوہات تھیں اوّل تو وہ غیر تخلیقی اور اکتا دینے والا کام ان کے مزاج کے مطابق نہ تھا۔ دوم

وہ رشوت کی کمائی سے دور رہنا چاہتے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رزقِ حلال کے کس قدر خواہش مند ہیں۔

ملک مقبول احمد نے جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اپنے اندر نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ جوانی کا طوفانی دور بہت نازک اور خطرناک ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ بھی اس طوفانی ریلے میں بہتے رہے۔ ان کی والدہ نے انہیں ازدواجی زندگی کے لئے بچپن ہی میں ننھیال میں ان کی ماموں زاد سے نامزد کر کے اس طوفانی ریلے کے آگے بند باندھ دیا تھا مگر اس کے باوجود وہ جوانی کے منہ زور گھوڑے کو پوری طرح قابو نہ کر سکے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"تاہم بعض اوقات دریا کے تیز بہاؤ کے سامنے کھڑے رہنا ممکن نہیں ہوتا۔ میں فرشتہ تو نہیں تھا۔"

انہوں نے کس قدر سادہ اور معصومانہ انداز میں اپنی جوانی کی طوفان خیزی کا اظہار کیا ہے کہ ان کی جوانی کی ذہنی کیفیت کو اس جملے کے آئینے میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

ان کی پہلی شادی بڑے ٹھسے سے ہوئی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ ان کی بیوی نظیر بیگم بہت خوبصورت تھی اور ملک صاحب اس کی خوبصورتی سے خاصے متاثر تھے مگر کچھ عرصے کے بعد اس نے ملک صاحب کی والدہ کے ساتھ گستاخانہ رویہ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ سمجھانے کے باوجود اس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی اور ایک روز ناراض ہو کر اپنے والدین کے پاس چلی گئی اور ملک صاحب کے سمجھانے کے باوجود اپنے مؤقف پر ڈٹی رہی۔ اس دوران منی آرڈر کے ذریعے اسے خرچہ بھیجا جاتا رہا۔ وہ بیمار رہنے لگی تو ملک صاحب اسے منت سماجت کر کے لاہور لے کر آئے۔ ڈاکٹروں نے آپریشن تجویز

کیا وہ نہ مانی اور والدین کے پاس چلی گئی اور وہیں 1980ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ان کی دوسری شادی نہایت سادگی سے خورشید بیگم کے ساتھ ہوئی۔ اس معصوم چہرہ خاتون نے اپنے حسن سلوک سے نہ صرف ملک صاحب کے دل میں اپنے لئے جگہ بنالی بلکہ ان کی والدہ کی خدمت گاری اور تابع فرمائی میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اہل خانہ کی محبت کے علاوہ صفائی سے بھی اسے جنون کی حد تک پیار تھا۔ ملک مقبول احمد خورشید بیگم کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''کوئی لاکھ کہے کہ بہو ہونے کے ناتے، اپنی ساس کی خدمت کرنا خورشید کا فرض تھا اور پھر وہ اس کی پھوپھی اور پھوپھا تو تھے۔ سگھڑ لڑکیاں ایسا ہی کرتی چلی آئی ہیں تاہم میں خورشید کا ممنون احسان ہوں کہ اس نے میری بے جی کو کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا۔''

ملک مقبول احمد جب لاہور وارد ہوئے تو ان کے پاس سرمایہ کم تھا مگر اقبال کی شاعری سے حاصل کیا ہوا یقین محکم، عمل پیہم کا جذبہ ان کے اندر فزوں تر تھا۔ جس نے انہیں قدم آگے بڑھانے میں بڑی معاونت کی۔ انہوں نے شاہ عالم مارکیٹ میں ایک فلیٹ کرائے پر حاصل کیا۔ جس میں انہوں نے ''چودھویں صدی'' کا دفتر بنایا اور ملحقہ حصے میں رہائش اختیار کر لی۔ ساتھ ہی پبلشنگ کا کام بھی شروع کر دیا۔ ماہنامہ ''نئے زاویے'' کا ڈیکلریشن بھی حاصل کر لیا۔ پبلشنگ کے کام میں کافی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ حتیٰ کہ اپنی بیوی کے زیورات تک فروخت کر کے اس کام میں لگا دیئے گئے۔ ناسازئ حالات کے باوجود ہمت نہ ہاری۔ بالآخر ان کی جہد مسلسل، ثابت قدمی اور حوصلہ مندی کی وجہ سے انہیں طباعت میں کامیابی حاصل ہو گئی اور ان کے مالی حالات رفتہ رفتہ بہتر ہوتے گئے۔

1957ء میں مقبول اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا۔ اس ادارے کے قیام کے بعد ہی ملک مقبول احمد نے اپنی زندگی کی ایک بڑی شاہراہ پر قدم رکھا تھا۔ ان کے نزدیک کتب کی اشاعت سے صرف روپیہ کمانا مقصود نہ تھا بلکہ وہ ایسی کتابوں کی تلاش میں تھے جو دلوں میں روشنی کے چراغ روشن کر سکیں۔ ان دنوں رئیس احمد جعفری بے مثل شہرت کے حامل باکمال ادیب تھے۔ ان کا مطمع نظر اپنے قلم کو مسلمانوں کی بھلائی اور ترقی کے لئے استعمال کرنا تھا۔ انہوں نے ملک صاحب کی درخواست پر دو ناولوں کے مسودے انہیں عطا کیے۔ جو اشاعت کے فوراً بعد فروخت ہو گئے اور لگایا ہوا سرمایہ منافع کے ساتھ واپس آ گیا۔ جعفری صاحب کے ناولوں کی فوراً فروخت سے ملک صاحب کے اندر حوصلہ اور اعتماد پیدا ہو گیا۔ ابوالکلام کی خودنوشت ''انڈیا ونز فریڈم'' کا اردو ترجمہ جعفری صاحب نے ان کی درخواست پر قلیل عرصے میں ''آزادیٔ ہند'' کے عنوان سے کیا۔ جس کے تین ایڈیشن ایک ماہ کے قلیل عرصے میں فروخت ہو گئے۔ اس کتاب نے مقبول اکیڈمی کو شہرت اور مقبولیت بخشی۔ اس کے بعد کتابوں کی اشاعت اور فروخت کا سلسلہ تیز تر ہو گیا۔

ملک صاحب نے چار مرتبہ حج اکبر اور کئی حج اصغر ادا کیے۔ جن کا ذکر انہوں نے مختصر الفاظ میں اپنی آپ بیتی میں بھی کیا ہے۔ جمیل آذر کو بھی حج کی سعادت نصیب ہوئی ہے جس کا ذکر ''راہ نوردِ شوق'' میں موجود ہے۔

1965ء میں بھارتی فوج نے سیالکوٹ کی سرحد پر دھاوا بول دیا اور ملک صاحب کا گاؤں دیووال ان کے قبضے میں چلا گیا۔ بھارتی فوج نے وہاں بے پناہ تباہی مچائی اور لوگوں پر ظلم وستم کیے۔ انہوں نے ملک مقبول احمد کی بیمار پھوپھی کے سر کے بال منڈوا دیئے۔ ان کی پھوپھی یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور اپنا دماغی توازن کھو بیٹھیں اور کچھ عرصہ کے بعد لاہور کے ایک ہسپتال میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ملک مقبول احمد اس

وقت لاہور میں تھے اور بے بسی کا شکار تھے۔ 1979ء کو ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور اس کے نو سال بعد ان کے والد بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ 1989ء میں وہ گلشن اقبال علامہ اقبال ٹاؤن میں رہائش پذیر تھے۔ ان کے گھر ڈاکہ پڑا اور ڈاکو گھر کا سامان لے گئے اور ان کی ملازمہ کو زخمی کر گئے۔ اس واقعہ سے گھر کے لوگ اتنے خوف زدہ ہوئے کہ وہ مکان بیچ کر جوہر ٹاؤن میں دوسرا مکان خرید لیا۔ 1990ء میں رائیونڈ کے قریب 113 کنال اراضی خریدی تا کہ وہاں کاغذ بنانے کی فیکٹری لگائی جائے مگر یہ منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔ ان حادثات کے باوجود انہیں پبلشنگ شعبے میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ جس کا اعتراف بین الاقوامی مارکوئیس پبلشنگ بورڈ نے بھی کیا اور ان کا اسم گرامی 1999ء کے چھٹے ایڈیشن میں شائع کیا۔ ملک مقبول احمد کی حسن صداقت کی اس داستان حیات کے بارے میں پروفیسر جمیل آذر ''راہ نوردِ شوق'' کے آخری صفحہ 264 پر لکھتے ہیں۔

> ''اب پتہ نہیں میری یہ کتاب ان کی سوانح حیات ہے یا میری۔ یا ہم دونوں کی یا ہمارے پورے معاشرے کی جس میں ہم سب رہ رہے ہیں اپنی پوری خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ ملک مقبول احمد کی داستان حیات حسن وصداقت کی کہانی ہے۔ حسن سچ ہے اور سچ ہی حسن ہے''۔

امید واثق ہے کہ ''سفر جاری ہے'' کی طرح یہ کتاب بھی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی اور اسے پڑھ کر اصل سوانح حیات کا سا لطف آئے گا۔

..........☆☆..........

''سفر جاری ہے''......ایک خودنوشت

آپ بیتی کی عمارت عہد رفتہ کی یادوں کی اینٹوں سے تیار کی جاتی ہے۔ یہ اینٹیں کھردری اور رف بھی ہوتی ہیں۔ خوبصورت اور شفاف بھی۔ ایک خودنوشت لکھنے والا دونوں قسم کی اینٹوں کو اپنی آپ بیتی کی عمارت میں اتنی عمدگی سے لگاتا ہے کہ قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خود اپنی آنکھوں سے خودنوشت لکھنے والے کے گزرے ہوئے تلخ و شیریں حالات دیکھ رہا ہو۔ ماضی کے بند در اور دریچے کھول کر یادوں کے جگنوؤں کو رقص کناں دیکھنا ہر ذی شعور شخص کا من پسند مشغلہ ہوتا ہے مگر ایک آپ بیتی نگار اپنے بیتے ہوئے دنوں کو آواز دیتے ہوئے دوسروں کو بھی اس میں شامل کر لیتا ہے۔ یہ خودنوشت کا کمال ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی کو اتنی خوبصورتی سے صفحہ قرطاس پر اتارتا ہے کہ دوسروں کو بھی اس میں اپنی دلچسپی کا سامان مل جاتا ہے۔

سوانح نگاری اور خاکہ نگاری کی سرحدیں اس قدر قریب ہوتی ہیں کہ اگر خاکہ نگار احتیاط سے کام نہ لے تو خاکہ لاشعوری طور پر سوانح نگاری کی مملکت میں داخل ہو جاتا ہے۔ خاکہ نگار کا کام سوانحی حالات بیان کرنا نہیں بلکہ افکار و کردار کی مدد سے موضوع خاکہ کو بحیثیت انسان نمایاں کرنا ہوتا ہے۔ ایک خودنوشت اپنی آپ بیتی میں پیدائش سے دور حاضر تک کے تمام حالات، واقعات اور حادثات کو نہایت تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ جبکہ خاکہ نگار حالات، واقعات اور حادثات کے اس ڈھیر میں سے صرف ان واقعات اور

حادثات کا انتخاب کرتا ہے جس سے شخصیت کی سیرت واضح ہو سکے اور اس پر کسی اور کی شخصیت کا اثر نہ ہو سکے۔ خاکہ اپنا بھی تحریر کیا جا سکتا ہے اور دوسروں کا بھی لکھا جا سکتا ہے۔ مگر آپ بیتی میں مصنف اپنی نجی زندگی کو زیر بحث لاتا ہے اور اسے ویسے ہی پیش کرتا ہے جیسی کہ وہ ہے۔ وہ نہ تو کچھ چھپانے کی کوشش کرتا ہے اور نہ ہی فرضی واقعات کے ذریعے اسے رنگین اور دلچسپ بنانے کی سعی کرتا ہے۔

ملک مقبول احمد ایک نامور، تجربہ کار، کامیاب اور بہت پرانے پبلشر ہیں۔ ان کے ادارے مقبول اکیڈمی نے ملک کے بہت سے جید مصنفین کی کتابیں شائع کی ہیں۔ بے شمار مصنفین کے ساتھ ان کے ذاتی تعلقات ہیں اور ان میں سے بعض ان کے بہترین دوست بھی ہیں۔ ''سفر جاری ہے'' ان کی خودنوشت ہے جس میں چند مصنفین کا تذکرہ اور تصاویر بھی موجود ہیں۔ جن میں احسان دانش، رئیس احمد جعفری، میرزا ادیب، اے حمید، ڈاکٹر انور سدید، حفیظ تائب، طارق اسماعیل ساگر، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر وحید قریشی، مولانا حامد علی خان، عبدالعزیز خالد، اظہر جاوید، ساغر صدیقی، غلام الثقلین نقوی اور ایم اسلم کے نام بہت نمایاں ہیں۔ خواتین میں بلقیس ریاض، ثریا خورشید، ادا جعفری، سلمیٰ اعوان، عذرا اصغر، رضیہ فصیح احمد اور نشاط فاطمہ قابل ذکر ہیں۔

ان نامور مصنفین اور ان کی کتب کے درمیان اپنی عمر عزیز کا ایک طویل عرصہ گزارنے کے باوجود ان کے دل میں کبھی خود لکھنے کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ ان کے اندر کے ادیب کو جونجانے کب سے ان کے بھیتر چھپا بیٹھا تھا۔ اس کا کھوج لگانے، باہر لانے اور لکھنے پر آمادہ کرنے کا کام ان کے پوتے، پوتیوں نے انجام دیا۔ ان کے چند ادیب دوستوں نے بھی انہیں اپنی آپ بیتی لکھنے پر آمادہ کیا۔ بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے اپنے اندر کے ادیب کی طرف کبھی دھیان نہیں دیا تھا۔ ادیب دوستوں اور پوتے پوتیوں کی

نشاندہی پر انہوں نے اپنے اندر کے ادیب کی طرف توجہ دی تو ''سفر جاری ہے'' جیسی معیاری، آسان اور خوبصورت آپ بیتی صفحہ قرطاس پر چم چم کرنے لگی۔

علی سفیان آفاقی ''سفر جاری ہے'' پر ایک دلچسپ خودنوشت کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

''اس خودنوشت کا ہر صفحہ ملک صاحب کے شوق جستجو، محنت ولگن اور سادگی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی شخصیت کا کوئی بھی پہلو چھپا کر نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ خودنوشت کے خاتمے پر قاری اپنے تجربے اور مشاہدے میں بہت کچھ اضافہ کر کے کتاب بند کرتا ہے۔ انہوں نے زندگی کے اہم واقعات اور زندگی میں داخل ہونے والی شخصیات کا تفصیلی خاکہ پیش کر دیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ایک محنتی، ان تھک، خدا ترس اور انسان دوست شخص کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے''۔

ملک صاحب نے اپنی آپ بیتی میں بچپن سے لے کر دور موجود تک کے تمام حالات وواقعات کو سادہ مگر پرکشش الفاظ میں اتنی روانی سے بیان کیا ہے کہ مطالعہ کے دوران قاری کو کسی مقام پر بھی بوریت کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ وہ نہایت انہماک سے آپ بیتی کا مطالعہ کرتا اور لطف اٹھاتا ہے اور ایک محنتی، ایماندار، صابر، پرخلوص اور نیک نیت انسان کی زندگی کے گوناگوں تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کی سعی کرتا ہے۔ ملک صاحب اپنی آپ بیتی لکھتے ہوئے افراط وتفریط کا شکار نہیں ہوئے۔ انہوں نے اپنی خودنوشت میں خود کو ویسا ہی دکھایا ہے جیسا کہ وہ ہیں۔ اپنی غربت اور تنگ دستی کا ذکر بھی وضاحت سے کیا حتیٰ کہ اپنی بیوی کے زیورات کو فروخت کرنے کو بھی صرف نظر نہیں کیا۔ اپنے رشتہ داروں کو بھی ویسا ہی دکھایا ہے جیسا کہ

وہ ہیں۔ ورنہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ معاشرے میں جب کسی اہم مقام پر پہنچ جاتے ہیں تو غریب رشتہ داروں کو اپنی قلمرو سے باہر نکال دیتے ہیں۔ اگر خونی رشتوں کا ذکر ناگزیر ہو جائے تو ان پر ملمع چڑھا کر پیش کرتے ہیں مگر ملک صاحب نے اپنی اور اپنے خاندان کی ویسی ہی تصاویر پینٹ کی ہیں جیسا کہ ہیں۔ تصاویر پینٹ کرتے وقت اور یجنل رنگ استعمال کیے ہیں۔ مانگے تانگے کے شوخ وشنگ رنگ استعمال کر کے ان کے اصل خدوخال چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے واقعات کو خفیہ رکھنے کی سعی بھی نہیں کی اور نہ ہی اپنی پسند کی عینک لگا کر انہیں دیکھا اور دکھایا ہے۔ انہوں نے نہایت سادگی سے اپنی آپ بیتی میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ان کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔ تمام خوبصورت لڑکیاں انہیں بہت اچھی لگتی تھیں اور وہ ہر خوبصورت لڑکی کو دل دے بیٹھتے تھے۔ ''سفر جاری ہے'' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

''یہ اعتراف کرنا کوئی غیر معمولی بات نہ ہوگی کہ ''میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا''۔ میں ہر خوبصورت لڑکی کو دل دے بیٹھتا۔ خوبصورت، دلکش شخصیت کے سامنے دل و دماغ پر قابو نہ رہتا تھا۔ میری کیفیت کچھ یوں ہو جاتی تھی۔

تیرے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

بابا خیرو کی بیٹی شمی کا دل کو اچھا لگنا اور ہر وقت اس خوبصورت لڑکی کو اپنی آنکھوں کے سامنے رہنے کی خواہش کرنا۔ اسے دیکھنے کے لئے بلا جواز اس کے گھر کے سامنے سے گزرنا، بدقسمتی سے اس حسین لڑکی کا بچپن میں انتقال ہو جانا۔ ملک صاحب کا بوجھل قدموں اور پرنم آنکھوں سے اس کے جنازے میں شامل ہونا۔ اسے منوں مٹی کے نیچے دفن ہوتے دیکھ کر دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا اور ایک عرصے تک اس کی جدائی میں بے چین

رہنا ایک فطری عمل ہے۔ بعدازاں وہ اپنے گھر کی کھوئی سے پانی بھرنے والی دو سگی بہنوں شہناز اور شمشاد سے متاثر ہوئے اور اپنے دل میں ان کی محبت کے چراغ روشن کیے مگر شہناز نے بچپن میں ہی بارزیست اتار پھینکا اور شمشاد سے محبت کا کھیل جاری رہا۔ قول وقرار ہوئے مگر بدقسمتی سے یہ محبت بھی پروان نہ چڑھ سکی اور اس کے والدین نے اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی دوسرے گاؤں میں کردی تو یہ طوفانی اور افلاطونی محبت بھی اپنے انجام کو پہنچ گئی۔

ملک مقبول احمد کو اپنے گاؤں دیووال (جو ضلع سیالکوٹ میں واقع ہے) سے والہانہ محبت ہے۔ انہوں نے اپنے گاؤں کی طرز معاشرت اور تہذیب وتمدن کی عکاسی اتنے میٹھے اور دلنشین انداز میں کی ہے کہ قاری اس کی چاشنی سے چپک کر رہ جاتا ہے اور اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ وہاں کے ساون، میلوں ٹھیلوں، ناٹکوں، کچے پکے گھروں، گلیوں کوچوں، جوہڑوں، ندی نالوں، کھیتوں کھلیانوں، کنوئیں سے پانی بھرتی پنہاریوں، وہاں کے سادہ اور پرخلوص لوگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔

ملک مقبول احمد نے اپنی آپ بیتی میں اپنے بچپن کے چند دوستوں اور گاؤں کے چند انوکھے کرداروں کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان کے دوستوں میں میر خلیل احمد اور گیان چند کو وہ اب بھی یاد کرتے ہیں۔ گیان چند ان کے کلاس فیلو تھے اور دونوں اکٹھے سکول سے بھاگا کرتے تھے۔ بیری کے تنوں پر بیٹھ کر گپیں لگانا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ گاؤں کے کرداروں میں ماسٹر فیروز دین، چودھری مولا داد، میاں اللہ ماہی اور چودھری دسوندھی خان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ماسٹر فیروز دین ایک ایسے استاد تھے جو بچوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی کردار سازی پر بھی پوری توجہ دیتے تھے۔ اکثر کرداروں کے نام اپنے اندر دیہی ثقافت کی خوبو لئے ہوئے ہیں۔ ان کرداروں میں ایک کردار اللہ ماہی کا ہے۔

وہ ایک غیر شادی شدہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔اس کی دکان سکول کے راستے میں تھی۔چھٹی سے پانچ منٹ پہلے وہ اپنی دکان بند کر دیتا تھا۔وجہ یہ تھی کہ اسے سکول سے جاتے ہوئے بچے دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا۔تاہم بعد میں اس کی شادی ہوگئی اور اب اس کے بچے بھی جوان ہو گئے ہیں۔ چودھری دسوندھی خان گاؤں کا ایک جاندار کردار ہے۔وہ معروف گاؤں ورک کے ذیلدار تھے۔بڑے سخی، ہمدرد اور مخلص انسان تھے۔گاؤں کے لوگوں پر بہت مہربان تھے۔ان کے دکھ سکھ میں برابر شریک ہوتے تھے۔لوگوں کے مسائل حل کر کے انہیں دلی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ چنانچہ لوگ ان کے خوف سے نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے ان کی عزت کرتے تھے۔ملک صاحب کی بھی انہوں نے بڑی معاونت کی تھی اس لئے انہوں نے اپنی سوانح میں چودھری دسوندھی کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے اور انہیں اپنا محسن قرار دیا ہے۔

شبستان شباب میں قدم رکھتے ہی ملک صاحب اپنی ماموں زاد نظیر بیگم سے ازدواجی بندھن میں بندھ گئے مگر یہ شادی زیادہ عرصہ تک نہ چل سکی۔نظیر بیگم ان کی والدہ سے جو اُن کی پھوپھی بھی تھیں بدتمیزی سے پیش آنے لگی۔وہ ضد کی پکی اور ذہن کی کچی خاتون تھی۔ ملک صاحب کے متعدد بار سمجھانے بجھانے اور دھمکانے کے باوجود اپنی حرکت سے باز نہ آئی اور بالآخر روٹھ کر اپنے والدین کے پاس چلی گئی۔کافی عرصہ کسی مہلک بیماری میں مبتلا رہنے کے بعد وہیں اس کا انتقال ہوگیا۔ملک صاحب کی دوسری شادی نہایت سادگی اور خاموشی سے ہوئی۔ان کی دوسری شریک حیات خورشید نے اپنے حسن سلوک سے سب گھر والوں کے دل جیت لئے اور ان کی والدہ کی ایسی خدمت اور تابع فرمانی کی کہ جس کی مثال کم کم ہی ملتی ہے وہ نہایت نفیس اور سلیقہ شعار خاتون ہے۔ صفائی ستھرائی کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ ہر وقت آئینے کی طرح گھر کو چمکائے رکھتی

ہیں۔خورشید بیگم نے اس سلیقے سے گھر سنبھالا کہ ملک صاحب کو گھر کی طرف سے بالکل بے فکری ہوگئی اور وہ اقبال کے اس شعر کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہو گئے۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
تیرے سامنے آسمان اور بھی ہیں

ملک صاحب نے جب پاکستان کے دل لاہور میں قدم رکھا تو جے وی کی سند، تھوڑا سا سرمایہ زمانے کے تھپیڑوں کے علاوہ اقبال کی شاعری سے حاصل کیا ہوا یقین محکم عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کا جذبہ ان کے پاس تھا۔شاہ عالم مارکیٹ میں ایک فلیٹ کرائے پر حاصل کر کے اس کے ایک کمرے میں میگزین ''چودھویں صدی'' کا دفتر بنایا اور ساتھ ہی پبلشنگ کا کام بھی شروع کر دیا۔پبلشنگ میں تو فوری طور پر کامیابی حاصل نہ ہوئی البتہ میگزین کی باقاعدہ اشاعت کا ڈیکلریشن مل گیا۔احسان دانش اس میگزین میں بطور نگران شامل تھے۔انہیں پبلشر بن جانے کے اس سفر میں آلام وادبار، تہی دامنی اور بے زری کا قدم قدم پر سامنا کرنا پڑا۔وہ بدنصیبی اور عسرت کے تمام وار علامہ قبال کی ڈھال پر روکتے اور قدم قدم چلتے رہے اور بالآخر پبلشنگ کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے۔

ملک مقبول احمد کے دل میں لاہور کا نامور پبلشر بننے کی شدید خواہش تھی اور اس خواہش کی تکمیل کے لئے کو نور چیمبر میں دفتر اور رہائش کے لئے کرائے پر ایک فلیٹ حاصل کیا۔PIBC کے نام سے پرنٹنگ پریس قائم کیا مگر یہ کاروبار نہ چل سکا اور اپنے والد صاحب کی عمر بھر کی کمائی بارہ ہزار روپے تجربات کی نذر کر دیئے۔اس زمانے میں بارہ ہزار کی رقم ہاتھی کے وزن کے برابر ہوتی تھی۔اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس خسارے سے سنبھلنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔وہ طباعت سے تائب ہو کر اپنے گاؤں چلا جاتا اور زراعت کی طرف توجہ دیتا۔سچ ہے کہ ہاتھی کا وزن ہاتھی ہی اٹھاتا ہے۔اس

ناکامی سے ناامید ہونے کی بجائے ان کے جوش جنون میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ ان کی بلند حوصلگی، صبر، استقامت اور جہد مسلسل کو دیکھتے ہوئے بالآخر کامیابی نے انہیں اپنے گلے سے لگالیا۔

جب پبلشنگ کا کاروبار چل نکلا تو ان کے حاسدین بھی پیدا ہو گئے۔ جو اپنی تمام تر صلاحیتیں اور قوت انہیں نقصان پہنچانے اور ان کی شہرت کو داغدار کرنے میں صرف کرنے لگے۔ اپنے ایک کارکن کی ملک صاحب نے بددیانتی پکڑ لی۔ اسے غلطی کا احساس دلاتے ہوئے تسلیم کرنے کو کہا تو اس نے اپنی غلطی ماننے سے انکار کر دیا تو اسے فارغ کر دیا گیا۔ اس شخص نے بدلہ لینے کے لئے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیئے اور ان پر بے بنیاد الزام لگائے مگر سچ کے سامنے جھوٹ زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا۔

1961ء میں سرگودھا کے انسپکٹر آف سکولز نے لائبریری کتب کی فراہمی کے ٹینڈر بذریعہ اخبارات طلب کیے تو مقبول اکیڈمی کا ٹینڈر منظور ہوگیا اور بروقت آرڈر کی تکمیل کر دی گئی تو مقبول اکیڈمی کی اس عظیم کامیابی پر حاسدین کے سینوں میں حسد کی آگ بھڑکنے لگی اور وہ مقبول اکیڈمی کے خلاف خوب نمک مرچ لگا کر اخبارات میں جھوٹی خبریں چھپوانے لگے۔ علاوہ ازیں حاسد ناشرین کی ایک میٹنگ کے بعد اس اکیڈمی کے خلاف ایک درخواست افسر اعلیٰ کو گزاری گئی۔ چنانچہ کیس انسداد رشوت ستانی کو تحقیق کے لئے بھجوا دیا گیا اور محکمانہ تحقیقات کے نتیجے میں ڈویژن کے انسپکٹر سکولز سمیت کئی افراد معطل کر دیئے گئے۔ ملک صاحب نے اپنے محسن چودھری دسوندھی کے ہونہار فرزند ظفر اقبال ورک کو اپنا وکیل مقرر کیا اور چند پیشیوں کے بعد ہائی کورٹ میں رٹ دائر کر دی گئی۔ کچھ عرصے کے بعد فیصلہ مقبول اکیڈمی کے حق میں ہوگیا اور سرگودھا کے تمام افسران کو بحال کر دیا گیا۔ مقبول اکیڈمی ایک ایسی تند و تیز آندھی ثابت ہوئی جس نے

مخالف حاسدین کے اتحاد کا شیرازہ ریت کے ذروں کی طرح بکھیر دیا۔

ملک مقبول احمد ایک عرصہ تک اس کاروبار کی چھوٹی چھوٹی سڑکوں پر آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ جب انہیں اس کاروبار کے نشیب و فراز سے بخوبی آگہی ہوگئی تو کافی غور و فکر کے بعد مقبول اکیڈمی قائم کر کے پبلشنگ کی شاہراہ پر قدم رکھا تو رفتار میں تیزی آنا قدرتی بات تھی۔ اس کے بعد اس ادارے سے ایسی کتب کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جو نفع کے ساتھ ساتھ لوگوں کے دل و دماغ کو بھی روشن کر سکیں۔ اس ضمن میں رئیس احمد جعفری نے ان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور پہلی قسط میں انہیں اپنے دو ناولوں کے مسودے عنایت کیے۔ جس سے ان کا حوصلہ بلند ہوا۔ انہوں نے دونوں ناول بہت کم مدت میں خوبصورت انداز میں شائع کیے ان کی قیمت بھی بہت کم رکھی۔ چنانچہ وہ بہت کم عرصے میں فروخت ہو گئے۔ ان دنوں رئیس احمد جعفری کے ناولوں کی بڑی مانگ تھی۔ ان ناولوں کی مقبولیت اور فوری فروخت سے مقبول اکیڈمی کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ بعد ازاں ملک صاحب کی گزارش پر جعفری صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد کی خود نوشت India wins Freedom کا ترجمہ ''آزادیٔ ہند'' کے عنوان سے کیا۔ اسے بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا۔ ایک ماہ کے قلیل عرصے میں اس کے تین ایڈیشن فروخت ہو گئے اور اب تک اس کے بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

احسان دانش کے پاس ایک نایاب کتاب ''تمدن عرب'' تھی۔ جسے فرانس کے نامور ادیب گستاؤلی بان نے تحریر کیا تھا۔ کتاب کافی ضخیم اور باتصویر تھی۔ جس کا ترجمہ سید علی بلگرامی نے کیا تھا۔ ملک صاحب نے کتاب پانچ سو روپے میں خرید لی۔ اس کی اشاعت کے اخراجات کا تخمینہ بہت زیادہ تھا اور ان کے پاس اس وقت اتنی رقم موجود نہ تھی۔ انہوں نے پہلے اپنے ماموں سے رقم ادھار حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ

ہوئی پھر دوسرے ماموں سے درخواست کی تو انہوں نے تھوڑی سی رقم عنایت کر دی مگر کتاب کی اشاعت پر جو رقم خرچ آنا تھی اس کی وہ عشر عشیر بھی نہ تھی۔

ملک صاحب ہر طرف سے مایوسی کے اندھیروں میں گھرے ہوئے تھے۔ لاکھ ذہن کے گھوڑے دوڑائے مگر کوئی سبیل نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے اچانک ان کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور اپنے ایک قلمی دوست ملک اللہ داد صاحب جن سے بالمشافہ کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ ان کا خیالی چہرہ ملک صاحب کے ذہن کی سکرین پر مسکرانے لگا۔ چنانچہ وہ ملک اللہ خان کے گاؤں سلطان خیل میانوالی گئے۔ خاطر مدارات کے بعد اللہ داد خان نے ان کی اچانک آمد کے بارے میں دریافت کیا تو ملک صاحب نے مناسب الفاظ میں اپنی آمد کا مدعا بیان کر دیا۔ اللہ داد خان صاحب نے پانچ ہزار کی رقم واپسی کا وعدہ لئے بغیر ان کے حوالے کر دی اور اپنی زندگی میں کبھی رقم کا مطالبہ نہیں کیا۔ البتہ ملک مقبول احمد نے وہ رقم اقساط میں ادا کر دی اور آخری قسط اس وقت دی گئی جب ملک اللہ داد خان صاحب اس دنیا میں موجود نہ تھے۔ وہ آج بھی اس احسان کو بھلا نہیں سکے۔ ''سفر جاری ہے'' میں ان کا ذکر بہت اچھے لفظوں میں کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ان پر احسان کرتا ہے تو وہ اسے کبھی فراموش نہیں کرتے بلکہ اس کا ذکر خیر کرتے نہیں تھکتے۔ ''تمدن عرب'' کے بعد انہوں نے ''تمدن ہند''، ''سیرت ابن ہشام'' اور ''عبرت نامہ اندلس'' ایسی ضخیم کتب شائع کیں۔ ''سیرت ابن ہشام'' کا نسخہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی سے حاصل کر کے ان کے تحریر کردہ دیباچے سمیت شائع کر دیا۔ ملک صاحب ان کے عقائد سے قطعاً نا آشنا تھے۔ سید نفیس الحسینی نے دیباچے کی وجہ سے ملک صاحب کے عقیدے پر اعتراض کیا تو محمد شریف قاسمی نے ان کا یہ اعتراض ملک مقبول احمد کو پہنچا دیا۔ جس کی وجہ سے انہیں بڑی ندامت ہوئی اور اپنا عقیدہ بیان کیا تو دونوں

صاحب مطمئن ہو گئے۔ بعد ازاں محمد اسماعیل پانی پتی کا دیباچہ کتاب کی قلمرو سے نکال کر اس کا ترجمہ احسان الحق سلیمانی سے کروایا گیا جو بڑے عالم فاضل اور محکمہ تعلیم میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ مقبول اکیڈمی نے سٹالن گراڈ، تیمور، ہمایوں، القاہرہ، الجزائر، استنبول صقلیہ اور بحری عقاب جیسے تاریخی ناول، معروف ناول نگار محمد سعید سے لکھوا کر شائع کیے جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتے رہے۔

لاہور کے معروف پبلشر عبدالحمید نظامی نے مقبول اکیڈمی سے بچوں کی چند چھوٹی چھوٹی کتابیں کثیر تعداد میں خریدیں تو ملک صاحب کے دل میں تجسس پیدا ہوا کہ وہ اتنی کتب کہاں سپلائی کریں گے۔ کھوجنے پر معلوم ہوا کہ کتب محکمہ تعلیم کو سپلائی کی جاتی ہیں اور اس کے ٹینڈر اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔ وہ ان ٹینڈروں میں حصہ لینے لگے۔ اس طرح ان کے لئے ترقی کا ایک نیا راستہ کھل گیا۔

ملک صاحب وہ خوش بخت انسان ہیں کہ جنہوں نے چار دفعہ حج اکبر اور کئی مرتبہ حج اصغر ادا کئے۔ پہلا حج اپنی اہلیہ کے ہمراہ 1986ء میں ادا کیا۔ دوسری مرتبہ بھی 2002ء میں اپنی اہلیہ کے ساتھ حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ 2006ء میں ان کی بیوی گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے ساتھ نہ جا سکیں تو وہ اکیلے ہی حج پر روانہ ہو گئے۔ ''سفر جاری ہے'' میں انہوں نے نہایت مختصر انداز میں سفر سعادت (حج) کا ذکر کیا ہے جو صرف تیرہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اگر وہ سفرنامہ نگار ہوتے تو ایک ضخیم کتاب صفحہ قرطاس پر چم چم کرنے لگتی۔ تاہم انہوں نے اپنی خودنوشت میں اس روحانی سفر پر جو صفحات قلم بند کیے ہیں۔ انہیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر ایک سفرنامہ نگار بھی چھپا بیٹھا ہے۔ جس کا سراغ وہ ابھی تک نہیں لگا سکے۔ امید ہے کہ جس طرح انہوں نے اپنے اندر کے خود نوشت نگار کا کھوج لگا کر اس سے خوبصورت اور معیاری خودنوشت تحریر کروائی ہے۔ اسی

طرح وہ کسی روز اپنے اندر کے سفر نامہ نگار کو بھی تلاش کر لیں گے اور اس سے اس روحانی سفر کو اتنے دلنشیں انداز میں لکھوائیں گے کہ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کو ایسا محسوس ہو گا جیسے وہ خود ملک صاحب کے ساتھ اس مبارک سفر میں شریک ہو اور ان تمام روحانی مناظر کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہو۔

زندگی واقعات، حادثات اور سانحات کی ایک ایسی شاہراہ ہے جس پر سے ہر ذی شعور انسان کو گزرنا پڑتا ہے۔ ''سفر جاری ہے'' پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ملک مقبول احمد کو بھی اپنی زندگی میں چند حادثات سے گزرنا پڑا۔ جنہوں نے ان کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کئے ہیں۔ 6 ستمبر 1965ء کی رات کی سیاہی ابھی دن کے اجالے میں متبدل نہ ہو پائی تھی کہ بھارتی فوج نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ ٹینکوں اور توپوں کی مسلسل گڑگڑاہٹ رات کے سناٹے کے سینے میں جگہ جگہ شگاف ڈالنے لگی۔ پاکستان کی فوج فوری طور پر اپنے وطن عزیز کے دفاع کے لئے پہنچ گئی تو بھارتی فوج کی پیش قدمی رک گئی۔ ملک صاحب کا گاؤں دیووال سیالکوٹ کی سرحد پر واقع تھا۔ بھارتی قبضے میں چلا گیا اور وہاں کے باسی بھارتی قیدی بن گئے۔ جن میں ملک صاحب کی بیمار پھوپھی شامل تھیں۔ تین ماہ کے بعد مریضہ ہونے کی وجہ سے انہیں رہا کر دیا گیا مگر اس دوران وہ اپنا دماغی توازن کھو چکی تھیں۔ ان کی بقیہ زندگی اسی حالت میں گزری۔ یہ حادثہ ان کی زندگی کا ایک ایسا سانحہ ہے جسے وہ کبھی نہیں بھلا سکے۔

دوسرا حادثہ تیز رفتار گاڑی چلانے کی عادت کی وجہ سے ملتان اور ساہیوال کے درمیان نہر کا ایک پل عبور کرتے ہوئے پیش آیا۔ جس میں زندگی موت کو ہاتھ لگا کر واپس آ گئی تو ملک صاحب نے کچی زمین پر سجدہ شکر ادا کیا۔ تیسرا حادثہ ان کی ''بے جی'' کے انتقال کا تھا جو ان سے عشق کی حد تک محبت کرتی تھیں۔ کئی سال تک ملک صاحب ان کی

جدائی کی شال میں لپٹے پھرتے رہے اور اب بھی انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ان کے اردگرد موجود ہوں۔ چوتھا حادثہ جب وہ شیطان کو کنکریاں مارنے جا رہے تھے تو قد آور حبشی حجاج کے ایک ریلے کی زد میں آ کر زمین پر گر پڑے مگر منیٰ کے فرش پر چت گر کر کچلے جانے سے قبل ہی انہیں کسی غیبی طاقت نے کھڑا کر دیا ورنہ منیٰ کے میدان میں گرے ہوئے حاجی کا کھڑا ہونا ممکنات میں نہ تھا مگر ان کی زندگی باقی تھی وہ بچ گئے۔ پانچواں حادثہ ان کے اباجی کی رحلت کا تھا۔ جو اپنی شریک حیات کی جدائی کے غم میں گھل گھل کر یکم مارچ 1988ء کو اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے۔ والد صاحب کی وفات کے بعد انہیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ ایک ایسے سایہ دار درخت سے محروم ہو گئے جو ان کی زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں اپنی گھنی چھاؤں سے انہیں راحت پہنچایا کرتا تھا۔ چھٹا حادثہ اس وقت پیش آیا جب وہ گلشن پارک علامہ اقبال ٹاؤن میں رہائش پذیر تھے۔ 10 دسمبر 1989ء کی شام ان کے گھر ڈاکہ پڑا۔ ڈاکو ان کی ملازمہ کو زخمی کر کے گھر کا سارا قیمتی سامان لے گئے اور پولیس میں رپورٹ درج کروانے کے باوجود اب تک نہ پکڑے گئے ہیں۔ اس کے بعد گھر والوں کے دلوں پر ایسا خوف طاری ہوا کہ وہ مکان فروخت کر دیا گیا۔

ملک مقبول احمد اہل قلم کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کا دل کی گہرائیوں سے احترام کرتے ہیں۔ مگر کچھ دکھری ٹائپ (یہ ترکیب ملک صاحب کی اختراع ہے) کے لوگوں سے انہوں نے دکھ اٹھائے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کا نام مخفی رکھتے ہوئے "سفر جاری ہے" میں دکھری ٹائپ کے لوگ کے عنوان سے ایک باب رقم کیا ہے۔

1۔ سیرت ابن ہشام کا نیا ترجمہ احسان الحق سلیمانی سے کروایا گیا۔ اس کتاب کی پروف ریڈنگ خود ملک صاحب نے کی پھر ایک معروف ادیب کو پروف

ریڈنگ کے لئے دیا تا کہ باقی ماندہ غلطیوں کو بھی حدود کتاب سے باہر نکال دیا جائے۔کافی عرصہ کے پرزور اصرار کے بعد انہوں نے مسودہ واپس کر دیا۔ پروف ریڈنگ تو کجا اس نے بنڈل کو کھول کر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی اور بل کی ادائیگی پر اس قدر اصرار کیا کہ اسے مطلوبہ رقم ادا کرنا پڑی اور پروف ریڈنگ کے لئے کسی اور صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں۔

2۔ ایک نامور ادیب اور صحافی نے ان سے اپنی خاکوں کی کتاب شائع کرنے کا معاہدہ کیا اور پیشگی رقم بھی وصول کر لی۔ جب کتاب تمام مراحل طے کر کے اشاعت کے دائرے میں داخل ہوئی تو ان پر انکشاف ہوا کہ وہ کتاب پہلے ہی کسی نئے پبلشر نے شائع کر دی ہے۔ شاید اس پبلشر نے اسے زیادہ معاوضہ ادا کر دیا تھا۔

3۔ ایک نامور ادیب نے ملک صاحب سے متعدد جلدوں پر مشتمل دو ضخیم سلسلہ وار کتابوں کی اشاعت کا معاہدہ کیا اور ابتدائی چند کتب کا کچھ معاوضہ بھی وصول کر لیا۔ کتابوں کو کمپیوٹرائزڈ کروایا گیا اور وہ دانشور مسودے پر ایک نظر ڈالنے کے لئے لے گیا اور دس بارہ سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ مسودہ واپس کیا نہ رقم مگر ملک صاحب اب بھی اس کی ناز برداری میں مصروف ہیں پرانے دوست جو ہوئے اور ملک صاحب کے لئے دوستی کا رشتہ بہت مقدم ہے۔

4۔ ایک دیرینہ دوست جو ایک معروف ناول نگار ہیں۔ان کے ناول کی کمپوزنگ میں دو چار غلطیاں رہ گئیں تو اس نے اپنے وکیل کی معرفت انہیں نوٹس بھجوا دیا کہ کسی مخالف کے کہنے پر دانستہ غلطیاں چھوڑ دی گئی ہیں۔ جس سے ملک

صاحب کو شدید صدمہ پہنچا۔

5۔ بچوں کے ایک معروف ادیب نے ان سے اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر کیا تو چار ہزار روپے پیشگی دیتے ہوئے ایک مضمون پر کتاب لکھنے کو کہا۔ ایک سال گزر جانے کے باوجود ان کی طرف سے کوئی پیش رفت کی اطلاع نہیں ملی۔ فون کریں تو اس کی طرف سے جواب ندارد، افسوس بچوں کے ننھے ننھے ذہنوں کو روشنی مہیا کرنے والا یہ ادیب خود اخلاقی اندھیروں میں گھرا ہوا ہے۔

6۔ ایک نوجوان شاعر نے اپنا کلام چھپوانے کے لئے ادارے کے کئی چکر لگائے۔ اس کی کتاب کا پیش لفظ محترمہ یاسمین حمید صاحبہ کا لکھا ہوا تھا اور چند سطور ڈاکٹر اختر شمار نے بھی اس کی تعریف میں تحریر کی تھیں۔ یاسمین حمید صاحبہ نے ایک خط کے ذریعے اس پیش لفظ سے انکار کیا تو ملک صاحب نے خط کے لئے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ وہ حرکت اس شاعر نے کی تھی اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس کے بعد مقبول اکیڈمی کے تمام در اور دریچے اس کے لئے بند ہو گئے۔

7۔ اس قسم کے چند کردار ملک صاحب کی کاروباری برادری میں بھی موجود ہیں۔ ان کی کاروباری برادری کے ایک شخص نے بیس برس قبل ان سے بیس ہزار روپے کتابوں کے ایک اہم آرڈر کی تکمیل کے لئے ادھار لئے تھے۔ خلوص نیت سے دی ہوئی وہ رقم ابھی تک ادا نہیں کی گئی۔ اُس طرف سے رقم کی واپسی کے وعدے تو بہت ہوتے رہے ہیں مگر افسوس ادائیگی نہیں ہوئی۔ ''دکھری ٹائپ'' کے لوگوں میں نامور شاعر بھی ہیں ادیب بھی سکالر بھی ہیں ناول نگار بھی۔ صحافی بھی ہیں کالم نگار بھی، پبلشر بھی ہیں اور پروفیسر ادیب بھی۔

"سفر جاری ہے" کے مطالعہ سے ملک مقبول احمد کی زندگی کے مختلف گوشوں سے آشنائی ہوتی ہے۔ ان کی زندگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کاروباری مصروفیات کی وجہ سے وہ اپنی صحت کا اس قدرے خیال نہ رکھ سکے جتنا کہ رکھنا چاہئے تھا۔ چنانچہ وہ مختلف قسم کی بیماریوں کے نرغے میں آ گئے۔ نزلہ، زکام، دردسر، سانس کی تکلیف، قبض کا ہونا، جسم کے مسام بند ہونے کی وجہ سے پسینے کا نہ آنا، جسم کے مختلف حصوں میں دردوں کا ہونا وغیرہ۔ جوانی میں قوت مدافعت کی وجہ سے جسم ان تمام بیماریوں کا مقابلہ کرتا رہا مگر جب شباب کا سورج ڈھلنے لگا اور نقاہت کے سائے بڑھنے لگے تو بیماریاں زور پکڑنے لگیں۔ مختلف قسم کے قابل اور تجربہ کار ڈاکٹروں کے علاج کے باوجود بیماریاں اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کرنے لگیں اور ان کے وزن میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا تو ان کے بیٹے ڈاکٹر ظفر نے سٹیم باتھ کا مشورہ دیا۔ لوئی کوہنی کی کتاب جس کے جرمن زبان میں پچاس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ سروتر یہ کرش سروپ نے "نیا علم شفا بخشی" کے عنوان سے کیا تھا۔ ملک صاحب نے اس میں درج شدہ ہدایات کے مطابق اپنا علاج شروع کیا۔ پانی کے اس علاج سے (جس میں ہیپ باتھ اور سٹیم باتھ دونوں شامل تھے) کچھ عرصہ بعد جسم سے فاسد مادوں کا اخراج شروع ہو گیا۔ اس سے پہلے والی جسمانی صحت کا پلڑا جھکنے اور بیماریوں کا اوپر اٹھنے لگا اور بڑھتا ہوا وزن کم ہونے لگا۔ ان کا فربہ جسم سلم اور سمارٹ ہو گیا وہ پھر سے عالم شباب میں داخل ہو گئے۔ اس طریقہ علاج سے انسان کی جیب پر کوئی بار نہیں پڑتا۔ صرف قوت ارادی، مستقل مزاجی اور صبر وضبط کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تمام اوصاف ان کی طبیعت میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

میرزا ادیب اپنے ایک خط میں علاج کے بعد ان کی صحت کے بارے میں اظہار مسرت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''سب سے پہلے تو میں اپنی اس خوشی کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ ماشاء اللہ جوان رعنا بن گئے ہیں۔ بہت ہی اچھی صحت عمر سے خاصے کم اور چہرے پر زندہ دلی کے نمایاں اثرات اور کیا کہا جائے۔''

ملک مقبول احمد نے اپنے بے پناہ کاروباری مصروفیات کے باوجود اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پر بھی پوری توجہ دی ہے۔ رب قدیر نے انہیں دو بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا ہے۔ تینوں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈاکٹر ہیں۔ ان کی ایک بہو اور داماد بھی ڈاکٹر ہیں۔ کتابوں کا کاروبار کرنے والے سخن ور کا گھرانہ ڈاکٹروں کا ٹھکانہ بن گیا ہے۔ اولاد کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ان کی شریک حیات بھی برابر شامل رہی ہیں۔

''سفر جاری ہے'' کسی پبلشر کی پہلی خودنوشت ہے۔ اس آپ بیتی پر پروفیسر جمیل آذر جیسے جید ادیب نے ''راہ نوردِ شوق'' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھ ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں بے شمار ادیبوں نے اس کی تعریف میں مضامین تحریر کیے ہیں۔ یہ خود نوشت اُردو آپ بیتی میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور امید ہے کہ اس خودنوشت کی طرح ملک صاحب سفرنامہ حج بھی اُردو ادب کے دامن میں ڈالنے کی تیاری شروع کر دیں گے۔

............☆☆............

''اہلِ قلم کے خطوط''......ایک مطالعہ

ملک مقبول احمد ملک کے ممتاز ناشروں کی پہلی صف میں نمایاں مقام پر کھڑے ہیں انہیں اتنی بڑی کامیابی دو چار برسوں میں نہیں نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے میں حاصل ہوئی ہے۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے انہیں بھاگتے لمحوں کے چلتے آروں کے راستوں سے گزرنا پڑا۔ بار بار ناکامیوں کا سامنا کرنے کے وہ اس درجہ عادی ہو گئے تھے کہ ''رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج'' والی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ بالآخر کامیابی کی دیوی انہیں اپنے درشن دینے پر مجبور ہو گئی۔ وہ جوان ہمت بھی ہیں اور مدبر بھی ناساعد حالات کی الجھی ہوئی ڈور کو اپنے حکمت عملی کے ناخنوں سے سلجھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ نامور پبلشر تو پہلے ہی تھے آپ بیتی ''سفر جاری ہے'' لکھ کر ادیبوں کی صف میں بھی اپنے لیے جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ان کی زندگی کے نشیب و فراز جاننے کے لیے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ یہ آپ بیتی اتنی آسان اور رواں زبان میں تحریر کی گئی ہے کہ ادب کا ایک عام سا قاری بھی اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

پچھلے سال ''سفر جاری ہے'' میری پیشانیٔ خیال پر افشاں بکھیر رہی تھی۔ امسال ''اہلِ قلم کے خطوط'' میرے زیر مطالعہ ہے۔ اس کتاب میں ایک سو چونتیس خطوط ہیں یہ تمام خطوط ملک صاحب کو ایک ناشر کی حیثیت سے ارسال کئے گئے ہیں۔ ان کا دورانیہ 1959ء سے 2009ء تک ہے۔ اتنے پرانے خطوط کو سنبھال کر رکھنا ان کی احتیاط

پسندی اور دور اندیشی کی دلیل ہے۔ شاید ان کے تصور میں بھی نہیں ہوگا کہ یہ خطوط
طباعت کے مراحل سے گزر کر قارئین کے زیر مطالعہ آئیں گے۔ اہل قلم کے خطوط میں
جہاں اختر جمال، ادا جعفری، مشفق خواجہ، انیس ناگی، میرزا ادیب، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر
انور سدید عبدالعزیز خالد، پروفیسر جمیل آذر، اے حمید، اظہر جاوید، پرتو روہیلہ،
جوگندر پال، حاجرہ مسرور، حفیظ تائب، رضیہ فصیح الدین، شفیق الرحمٰن، ڈاکٹر وحید قریشی،
محشر بدایونی، غلام الثقلین نقوی، ڈاکٹر سلیم اختر، عذرا اصغر اور غلام جیلانی برق جیسے نامور
قلم کار شامل ہیں وہاں مجھ جیسا گمنام ادیب بھی موجود ہے۔ اس کتاب میں اہل قلم کے
خطوط نام کی حروف تہجی ترتیب سے پیش کیے گئے ہیں۔ چنانچہ محمود و ایاز، بندہ اور بندہ نواز
ایک ہی صف میں کھڑے ہیں۔ خطوط کا یہ پہلا گلدستہ ہے جو اہل قلم نے ایک ناشر کو پیش
کیا ہے۔ ادیب اور ناشر کے درمیان خالص کاروباری نوعیت کا تعلق ہوتا ہے مگر ملک
صاحب ایک ایسے پبلشر ہیں جن سے قلمکار کاروباری امور کے علاوہ اپنے دل کی بات
بھی بلا تامل کہہ دیتے ہیں چنانچہ ان خطوط کے دریچوں سے ان کے بطون میں جھانکنے اور
ان کی نفسیات کو سمجھنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔ یہ خطوط ان کی دوست داری، ملنساری،
خوش اخلاقی، کرم فرمائی، بامروتی اور وضع داری کے مختلف گوشے ہائی لائٹ کرتے
ہیں۔ جو انہیں دوسرے پبلشروں سے منفک اور ممیز کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادباء
انہیں پبلشر سے زیادہ دوست اور بھائی سمجھتے ہیں۔ ان کے حسن اخلاق، وضع داری اور
بامروتی کے بارے میں لکھے گئے خطوط کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ ان سب کا حوالہ
دینا ممکن نہیں۔ تاہم چند خطوط کے اقتباسات درج کیے جا رہے ہیں جن کی روشنی میں
ملک صاحب کی ثابت قدمی نیک نیتی، جوہر شناسی اور علم دوستی جیسے اوصاف دیکھے جا سکتے
ہیں۔ وہ ایک سچے کھرے اور محنتی انسان ہیں۔ مقبول اکیڈمی کو اس مقام پر لانے کے

لیے انہوں نے اوچھے ہتھکنڈے استعمال نہیں کیئے۔ وہ مصائب و آلام کے تپتے ہوئے صحرا سے گزر کر اس سرسبز و شاداب وادی میں پہنچے ہیں۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو صحرا کی تپش سے گھبرا کر آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے کو ترجیح دیتا یا پھر پاؤں توڑ کر کسی درخت کے نیچے بیٹھ جاتا۔ ان اقتباسات کو دیکھئے جن کو پڑھ کر معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ ایک پبلشر کو تحریر کیئے گئے ہیں۔ ماہنامہ "تخلیق" کے مدیر اور نامور شاعر اور ادیب اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

اظہر جاوید: "ایک چیز ہوتی ہے دوستی۔ ایک کرم فرمائی۔ آپ مسلسل دوسرا عمل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ دوستی بھی برحق ہے لیکن آپ احسان بھی کرتے ہیں۔"

تاج سعید: "کراچی میں جمید کاشمیری سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بھی آپ کی بے حد تعریف کی ایسے دوستوں کے کہنے پر ہم مزید کیا اضافہ کر سکتے ہیں"۔

ضیاء شبنمی: "ابھی ابھی ٹیلی فون پر برادرم انور سدید سے "وصل صوتی ہوا"۔ انہوں نے آپ کی اس قدر تعریف کی کہ میں یہ سطور لکھنے پر مجبور ہو گیا۔ تشنۂ ادب و محبت آدمی ہوں شعر و ادب میرا اوڑھنا بچھونا ہے"۔

ظفر تاج: "محترم یہ سب کچھ آپ کی نیک نیتی، ثابت قدمی، عفو و درگزر، ایمان قلبی، طہارت بدنی، قوت ایمانی اور فیض روحانی کے طفیل ہے۔ اللہ تعالیٰ انہی وجوہات کی بنا پر اپنے خاص بندوں کو نوازتا ہے۔"

عنبرین تبسم شاکر: "آپ ایک سچے کھرے اور محنتی انسان ہیں آپ کی سوانح پڑھ کر میں نے یہی سبق حاصل کیا ہے کہ محنت کبھی ضائع نہیں ہوتی اور زندگی نام ہے جہد مسلسل اور عمل پیہم کا"۔

کنول عاصم: آپ بیک وقت پبلشر، ادیب، صوفی، جوہر شناس اور علم دوست ہیں۔

بعض خطوط میں خوگر توصیف کی طرف سے کتاب کے جلد شائع نہ ہونے پر ہلکی پھلکی شکایات بھی موجود ہیں مگر ایسے خطوط کی تعداد بہت کم ہے۔

ملک صاحب اپنی کاروباری مصروفیات کی وجہ سے صحت کی طرف کم توجہ دینے کی بنا پر مختلف قسم کی بیماریوں کے نرغے میں گھر گئے تو ان کی جسمانی توانائی گھٹنے اور وزن بڑھنے لگا۔ قابل ڈاکٹروں کے علاج کے باوجود جب کوئی خاطر خواہ افاقہ نہ ہوا تو ان کے بیٹے ڈاکٹر ظفر نے سٹیم باتھ کا مشورہ دیا تو انہوں نے ''نیا علم شفا بخشی کے نام سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتاب کے مطابق اپنا علاج شروع کر دیا۔ ہپ باتھ اور سٹیم باتھ کے ذریعے جسم سے فاسد مادوں کا اخراج ہونے لگا تو ان کا بڑھتا ہوا وزن کم ہونے لگا اور جسمانی توانائی میں اضافے کا عمل شروع ہو گیا۔ پانی کے علاج سے وہ حیرت انگیز طور پر سلم اور سمارٹ ہو گئے۔ وہ اس علاج کا مشورہ اپنے دوستوں کو بھی دینے لگے اور اپنی سوانح میں اس علاج کے فوائد کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ چنانچہ لوگوں کی توجہ اس علاج کی طرف مبذول ہوئی اور بہت سے ادیبوں نے اس سے استفادہ کیا۔ صرف دو خطوط کے پیراگراف درج کیے جا رہے ہیں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

''آپ نے جو طریق علاج لکھا ہے۔ میں نے اس پر عمل کیا تو حیرت ہوئی اور میرا معدہ بہتر کام کرنے لگا۔ بھوک تیز ہو گئی۔ پہلے اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف ہوتی تھی مگر اب میں کسی سہارے کے بغیر ہی کھڑا ہو جاتا ہوں۔ پہلے دس قدم چل کر سانس پھول جاتا تھا اب میں دو فرلانگ آسانی سے چل لیتا ہوں۔''

انیس یعقوب: ''نیا علم شافی'' کا جب مکمل طور پر قائل ہو گیا تو میرے اندر کا مبلغ بیدار ہوا۔ میں نے پورے جوش اور ولولے سے دوست، احباب اور عزیزوں کو اپنے ''نو دریافت شدہ'' علاج کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔''

اہل قلم کے خطوط میں سب سے زیادہ خطوط ملک صاحب کی آپ بیتی کے بارے میں تحریر کیے گئے ہیں ان میں سے چند اہم خطوط کے اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

احمد زین الدین: ''میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنی کتاب ''سفر جاری ہے'' ارسال کی جو موصول ہو گئی ہے۔ بے حد خوبصورت اور پر از معلومات کتاب ہے۔ جس میں آپ کی عملی زندگی کی ''کٹھنائیوں اور سفر حجاج اقدس کا مؤثر احوال پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ میں اس پر ضرور لکھوں گا۔''

اے حمید: ''سفر جاری ہے'' اس اعتبار سے بھی منفرد حیثیت رکھتی ہے کہ آج تک بڑے بڑے ناشروں نے دوسروں کی کتابیں چھاپی ہیں لیکن جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے اپنی کتاب لکھ کر کسی نے نہیں چھاپی۔ یہ کام آپ نے کر دکھایا ہے''۔

بانو قدسیہ: ''آپ کی کتاب ''سفر جاری ہے'' مجھ تک پہنچی۔ ابھی آنکھیں خراب اور صحت ٹھیک نہیں ''پذیرائی'' کا فلیپ ضرور لکھوں گی لیکن اس کا مسودہ نہیں پہنچا۔''

جان کاشمیری: ''سفر جاری ہے'' موصول ہوئی جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ یہ آپ بیتی ایک ایسے انسان کی ہے جو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا نہیں ہوا۔ اس کو منزل کی طرف نشان خود لگانا پڑا ہے۔ شاید اس کو ہی ''سیلف میڈ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔''

جوگندر پال: ''خوش رہیے! آپ کا خط ملا ہے اور خود نوشت بھی شکریہ۔ کتاب میں نے پڑھ لی ہے۔ آپ نے واقعی بہت عمدہ آپ بیتی لکھی ہے۔ تبصرہ حاضر کر رہا ہوں۔ مطلع کر سکیں تو میرا اطمینان ہو جائے گا۔''

ڈاکٹر وزیر آغا: آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اپنی کتاب ''سفر جاری ہے'' کا ایک نسخہ عطا کیا ہے۔ آپ کے ارشاد کی تعمیل میں کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات بھجوا رہا ہوں۔ خدا کرے آپ بخیر و عافیت رہیں۔''

ایک پبلشر کو لکھی گئی تحریریں عام طور پر عام فہم، کومل اور سبک اندام نہیں ہوتیں وہ سرتاپا کاروباری لین دین جیسے خشک معاملات پر مبنی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان کے مطالعہ سے نہ دل کو فرحت ملتی ہے نہ ذہن کو بالیدگی اور نہ نظر کو کشادگی حاصل ہوتی ہے۔اس کے برعکس اہل قلم کے خطوط میں ایسی بھی بہت سی تحریریں موجود ہیں جو تخلیقی اسلوب میں لکھی گئی ہیں۔اس لیے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

اظہر جاوید: ''بڑھاپے کے ساتھ ساتھ بے ترتیبی بڑھتی جارہی ہے۔ وقت گرفت ہی میں نہیں آتا۔پھر جب آپ ہوتے ہیں تو میں نہیں پہنچ پاتا۔جب میں پہنچ سکتا ہوں آپ نہیں ہوتے۔دعاؤں اور روفاؤں کا سلسلہ قائم ہے۔رب کریم آپ کو بے حدوحساب برکتیں دیں۔آمین!

امین راحت چغتائی: ''درموسم زمستاں، جاناں درچیز باید

یاروئے آفتابے یا روبہ آفتابے

''اتفاق ہے کہ ہم دونوں ہم عمر ہیں۔لہٰذا آپ اتفاق کریں گے کہ مصرع ثانی کے جزوثانی پر اکتفا ہی مناسب ہے۔''

افتخار امام صدیقی: ''اچھی اور منفرد جمالیاتی سطح پر سجی سنوری کتاب میری سب سے بُری کمزوری ہے اندرونی صفحات کی خوشبو مجھے مسحور کردیتی ہے اور میں گھنٹوں اسے نہارتا رہتا ہوں''۔

ریحانہ قمر: ''آپ پبلشر سے رائٹر بھی بن گئے۔ایسا بہت کم ہوا ہے۔رائٹروں کی کتابیں چھاپتے چھاپتے آپ کے اندر کا ادیب بھی جاگ اٹھا اور اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔بہرحال آپ کے اندر کا ادیب کامیاب رہا۔جس کا بہت دیر کے بعد پتہ چلا''۔

''ملک صاحب رائٹرز کو اپنے قبیلے کے افراد سمجھتے ہیں۔ان سے محبت کرتے

ہیں چنانچہ تخلیق کار بھی ان سے محبت کرتے ہیں اور اپنی پریشانیوں میں انہیں شریک کر کے اپنے دل کا بوجھ اتار کر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر پبلشر پس پردہ چلا جاتا ہے۔ دوست اور بھائی سامنے آجاتا ہے"۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: "میں پچھلے دنوں ایک بڑے حادثے سے گزرا اور ایک مستقل خلا اور احساس محرومی کے ساتھ کراچی سے واپس آیا۔ آپ سے دعاؤں کا طالب ہوں"۔

رفیع الدین شہاب: "امید ہے آپ خیرت سے ہوں گے۔ میں بھی اگرچہ خیرت سے ہوں اور لکھنے پڑھنے کا کام معمول کے مطابق کر رہا ہوں۔ لیکن اعصابی بیماری کی وجہ سے چلنے پھرنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے کافی عرصہ سے حاضر خدمت نہیں ہو سکا۔"

رئیس الدین رئیس: "سیدھے ہاتھ میں فریکچر آ گیا ہے۔ تکلیف زیادہ ہے۔ خط بھی بہت مشکل سے لکھ رہا ہوں۔"

اہلِ قلم کے خطوط میں جہاں اپنی پریشانیوں اور بیماریوں کا ذکر ہے وہاں ملک صاحب کی غمی خوشی میں شرکت کے خطوط بھی موجود ہیں۔ ڈاکے اور دیگر پریشانیوں کے خطوط کے علاوہ ان کی خوشیوں میں شمولیت کے نامے بھی کتاب میں موجود ہیں۔ عید مبارک، ملک صاحب کے بیٹے کی شادی اور پوتے کی ولادت پر لکھے گئے چند خطوط کے اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔ محشر بدایونی عید کی آمد پر لکھتے ہیں۔

"عید کی آمد آمد ہے۔ عید کے موقع پر اپنوں کی یاد کچھ زیادہ ہی آتی ہے۔ بے اختیار جی چاہا کہ آپ کو خط لکھوں اور عید کی "مبارک باد" کا ہدیہ پیش کروں۔ عید کے سعید موقع پر میرا ہدیہ قبول ہو۔"

سید واجد رضوی ملک صاحب کی طرف سے شادی کا دعوت نامہ موصول ہونے پر مبارک باد کا خط لکھتے ہوئے متعدد الجھنوں کے باعث شادی میں شرکت نہ کرنے پر

معذرت کا اظہار کرتے ہیں۔ دولہا اور دلہن کو دعائیں بھی دیتے ہیں۔

''برخوردار ڈاکٹر ظفر مقبول کی شادی میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا بہت بہت شکریہ۔ آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ یہاں متعدد الجھنوں کے باعث میں حاضر نہیں ہو سکوں گا لیکن میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دولہا اور دلہن کو ہمیشہ خوش اور آباد رکھے اور آپ کا سایہ ان کے سر پر تا دیر قائم رہے۔ انشا اللہ پھر کبھی آکر بالمشافہ بھی مبارک باد پیش کروں گا۔''

ان کے پوتے کی پیدائش کے پرمسرت موقع پر میرزا ادیب اپنے جذبات کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

''میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ کے باغ میں ایک نہایت خوبصورت پھول مسکراہٹیں بکھیرنے لگا ہے۔ اللہ کرے یہ پھول سینکڑوں سال مسکراتا رہے۔ ظفر بیٹے نے سعادت مندی کا ثبوت دے کر باپ بننے پر مٹھائی کھلائی ہے۔ آخر اپنے مقبول کا بیٹا ہے۔ سعادت مندی اور مروت تو اس کے ریشے ریشے میں ہوگی۔''

مندرجہ بالا اقتباسات جو اس مضمون میں درج کیے گئے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ خطوط ایک پبلشر کو تحریر کیے گئے ہیں۔ کاروباری امور کا ذکر نہ ہونے کی وجہ سے یہ نجی قسم کے خطوط معلوم ہوتے ہیں۔ جن میں اہل قلم نے اپنی ناکامیوں اور کامرانیوں۔ پریشانیوں اور خوشیوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ بیرونی ممالک کے حالات اور واقعات سے بھی آگاہ کیا ہے اور وہاں کے موسموں کی جانکاری بھی دی ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے روزمرہ واقعات کو بھی خطوط کے ذریعے ان تک پہنچانا ضروری سمجھتے ہیں۔ قمر نقوی صاحب فورٹ ورتھ، ڈنٹن اور ڈلس سے مشاعرے پڑھ کر تین روز کے بعد

لوٹے تو انہوں نے ملک صاحب کو اس بارے میں مطلع کرنا ضروری سمجھا۔

قمر نقوی: ''میں آج ڈلس سے تین روز بعد مشاعروں میں شرکت کر کے واپس آیا۔ فورٹ ورتھ ڈنٹن اور ڈلس میں تین روز متواتر مشاعرے ہوئے۔ جن میں ہزار ڈیڑھ ہزار سامعین کے مجمعے تو ہو ہی گئے۔ میں الحمدللہ سرفہرست رہتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے۔ گھر میں بچوں کو سلام و دعا''۔

جہاں تک میرے ناقص علم کا تعلق ہے۔ خطوط کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں اہل قلم نے کاروباری امور سے ہٹ کر بھی خطوط تحریر کئے ہیں۔ اس سے پہلے اردو ادب میں خطوط کی اس قسم کی کتاب موجود نہیں ہے۔ اس کے لیے ملک صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اتنے پرانے خطوط نہ صرف سنبھال کر رکھے بلکہ انہیں دیدہ زیب کاغذی پیرہن بھی پہنایا ہے۔ ان خطوط کا مطالعہ نئے لکھنے والے ادیبوں کی ناشر کو خطوط لکھنے میں رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دے گا اور انہیں اہل قلم کے حالات سے بھی آگاہ کرے گا۔

............☆☆............

انجم نیازی کے انشائیے

انجم نیازی جامع الحیثیات قلم کار ہیں وہ غزلیں، نعتیں اور مناقب بھی کہتے ہیں انشائیے بھی لکھتے ہیں۔ انہوں نے چند خاکے بھی تحریر کئے ہیں۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے انہوں نے جھنگ کے تین چار ادیبوں کے خاکے اردو کے پہلے خاکہ نگار فرحت اللہ بیگ کے شگفتہ انداز میں لکھے ہیں۔ ان کے خاکے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر خاکہ نگاری کے ''جراثیم'' وافر مقدار میں موجود ہیں مگر افسوس انہوں نے ان جراثیم کی پرورش کی طرف توجہ نہیں دی اگر وہ تواتر سے لکھتے رہتے تو میرا خیال ہے کہ اردو ادب کے بہترین خاکوں میں اضافے کا باعث ضرور بنتے۔ وہ شگفتہ مزاج اور بذلہ سنج ہیں۔ جس کا اظہار وہ روزمرہ کی گفتگو میں بھی کرتے ہیں اور ان کی تحریریں شوخی اور شگفتگی کی اجلی چادر میں لپٹی ہوتی ہیں۔ شگفتگی کا یہ ہالہ قاری کو ان کی تحریروں سے باہر نہیں جانے دیتا۔ انہوں نے نہ صرف خود خوبصورت انشائیے تحریر کئے ہیں بلکہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں قیام جھنگ کے دوران وہاں کے دو ادیبوں خیر الدین انصاری (مرحوم) اور حنیف باوا کو بھی اس راہ پر لگایا تھا۔

خیر الدین انصاری (مرحوم) نے ''لھکتی ڈال'' اور حنیف باوا نے ''دائروں سے باہر'' کے عنوان سے دو چراغ انشائیہ کی پگڈنڈی پر روشن کر کے اس کے راستے کو مزید منور کیا ہے۔

انجم نیازی کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ (اس کے بعد ان کو دوسرا مجموعہ ابھی تک اشاعت پذیر نہیں ہوا) ''میں سورج اور سمندر'' 1999ء کے پہلے مہینے کے پہلے ہفتے کے پہلے دن کاغذی پیرہن پہن کر قارئین کے زیرِ مطالعہ آیا تھا۔ ''میں، سورج اور سمندر'' کا تقریباً ہر انشائیہ قارئین کا شگفتگی سے معانقہ کرواتے ہوئے اس پر سوچ کے ایسے در وا کرتا ہے کہ اسے ہر جا جہان دیگر نظر آتا ہے۔

مزاح اور بذلہ سنجی ایسے درخت نہیں ہیں کہ جن کا پھل چکھنے کی انشائیے پر پابندی ہو مگر اسے کثرت استعمال کی اجازت نہیں ہے۔ اس سے اس کی طبیعت کے بوجھل ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ انجم نیازی اس بات سے بخوبی واقف ہیں۔ اس لیے وہ انشائیے میں مزاح کا اتنا استعمال نہیں کرتے کہ اس کی طبیعت پر گراں گزرے اور حدود کراس کر کے مزاح نگاری کے منطقے مین داخل ہو جائے۔ ان کے انشائیے ''فل سٹاپ'' کی یہ سطور ملاحظہ کیجیے جن میں شوخی بھی ہے اور شگفتگی بھی، بذلہ سنجی بھی ہے اور ظرافت بھی مگر ان کا استعمال اس ہوش مندی سے کیا گیا ہے کہ کہیں بھی اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے یہی وجہ ہے کہ انشائیے کی طبع نازک پر گراں گزرنے کی بجائے اس میں کھلی کھلی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

''جب میرے پاس عینک نہیں ہوتی یا میں عینک کے پاس نہیں ہوتا تو بسا اوقات میری نظریں فل سٹاپ کے اوپر سے گزر جاتی ہیں اور مجھے اس کا چھوٹا سا گول مٹول وجود نظر نہیں آتا اور آئے بھی کیسے؟ اگر عینک کا تعاون حاصل نہ ہو تو گھر کے اندر مجھے اپنے تخلیق کردہ چھوٹے چھوٹے چلتے پھرتے فل سٹاپ بھی نظر نہیں آتے جو میری زندگی کی خوبصورت کتاب کی خوبصورت عبارت کا حصہ ہیں اور جن کو دیکھے بغیر زندگی کا مفہوم اور کوئی معنی سمجھ میں نہیں آتا۔

جن کے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے مجھے اپنے وجود کو کتاب زندگی کی نت نئی
تحریر میں تحلیل کرنا پڑتا ہے۔''

انجم نیازی کے انشائیے اسلوب کی تازہ کاری اور خیال کی ندرت سے مملو ہوتے ہیں۔ وہ جب اشیاء پر چڑھتی ہوئی فرسودہ اور پا افتادہ تہوں کو ہٹا کر ان کے اندر جھانکتے ہیں تو انہیں ایک جہان معنی نظر آتا ہے۔ ان کے اندر چھپے ہوئے گوشوں کو نوک قلم کے سپرد کر کے انشائیے کے قالب میں ڈھالتے ہیں تو معمولی اشیاء اور مظاہر کو اتنا عمدہ لباس میسر آجاتا کہ غیر معمولی بن کر ذہن کو بالیدگی، دل کو کشادگی اور نظر کو تابانی عطا کرتی ہیں۔ ''فل سٹاپ'' پر غور کیجیے تحریروں میں جو کہ ایک ٹریفک کے سپاہی کا کردار ادا کرتا ہے۔ جس طرح لمبی لمبی ائیر کنڈیشن کاروں والوں کی نظر میں دھوپ میں کھڑے ہوئے ایک ٹریفک کانسٹیبل کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی مگر وہ اس کی مرضی کے بغیر اپنی گاڑیوں کو چند قدم آگے بڑھانے کے بھی مجاز نہیں ہوتے۔ اسی طرح ''فل سٹاپ'' کی بھی قاری کی نظر میں کوئی وقعت نہیں ہوتی مگر جب کوئی اسے نظر انداز کر کے اپنے مطالعے کی گاڑی کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی گاڑی دھچکوں اور جھٹکوں کی زد میں آجاتی ہے اور مجبور ہو کر اسے ''فل سٹاپ'' کی رہنمائی میں آگے بڑھنا پڑتا ہے دیکھئے انشائیہ ''فل سٹاپ'' میں وہ اس کی اہمیت اور حیثیت کس عمدگی سے بیان کرتے ہیں۔

''فل سٹاپ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ یہ بڑے بڑے جرنیلوں اور بڑے بڑے تیس مار خانوں کے آگے سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ اس وقت تک ان کو ایک قدم آگے نہیں جانے دیتا جب تک گرین سگنل آگے جانے کا اشارہ نہ کر دے اس کو بائیسکل روند سکتی ہے نہ فوجی ٹینک''

انشائیہ اظہار ذات کا بہترین ذریعہ ہے اپنی ذات کا اظہار تو تخلیق کار تمام

اصناف سخن میں کرتا ہے۔اس کے بغیر تخلیق تکمیل کے دائرے میں داخل نہیں ہو پاتی۔ ایک سنگ تراش اور مصور کی ذات کی تراشی ہوئی مورتیوں اور تصویروں میں موجود ہوتی ہے حتیٰ کہ ایک فوٹوگرافر بھی تصویر کھینچتے ہوئے لاشعوری طور پر اپنی ذات کا خفیف سانشان اس میں شامل کر دیتا ہے دوسری اصناف کی نسبت انشائیے میں اپنی ذات کا اظہار زیادہ بھر پور انداز میں ہوتا ہے۔ اکثر انشائیہ نگار اپنی ذات کا اظہار Indirect طریق پر کرتے ہیں۔ وہ زندگی کے معمولی اور غیر اہم پہلوؤں کو اس فنی چابکدستی سے پیش کرتے ہیں کہ قاری کو ان کے انشائیے میں داخل ہونے کی خبر تک نہیں ہو پاتی۔ زندگی کو کبھی صوفی اور کبھی مفکر کی نظر سے دیکھنا اور کبھی جمالیات کی عینک لگا کر اس کے خوبصورت اور انوکھے پہلو تلاش کرنا اپنی ذات کے اظہار کے مختلف ذرائع ہیں۔ انشائیہ انفرادی سوچ کا محرک ہے اس کے بطون میں چھپی ہوئی انشائیہ نگار کی ذات کو غور وفکر سے دیکھا جاتا ہے۔

انجم نیازی کے انشائیوں میں ان کی ذات کا اظہار مختلف زاویوں سے ہوا ہے کبھی تو ان کی ذات تھوڑی سی کاوش سے نظر آ جاتی ہے اور کبھی اس تک پہنچنے کیلئے آنکھوں کو غور وفکر کے مصفا پانی سے دھونا پڑتا ہے۔ انشائیہ ''ٹائم آوٹ'' کے اس اقتباس پر غور کیجئے۔

''سب سے مشکل دیوار میری ذات کی دیوار تھی جس نے تمام راستے روک رکھے تھے جس کے اوپر نیچے اور آگے پیچھے خوابوں اور سرابوں کے دھند لکے منڈلا رہے تھے۔ اس کے کئی روپ تھے اس کے قریب جاتا ہوں تو یہ دیوار مجھ سے صدیوں کی مسافت پر چلی جاتی ہے اور اس سے دور ہونے کی کوشش کرتا ہوں تو یہ میرے قدموں کی زنجیر بن کر روک لیتی ہے۔''

انجم نیازی کے انشائیوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ قاری کو ابتدا ہی میں اپنی

طرف متوجہ کر لیتے ہیں اور انشائیہ جوں جوں آگے بڑھتا رہتا ہے توں توں قاری کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ انشائیہ اپنے اختتام کو پہنچ جاتا ہے مگر قاری کافی دیر تک اس ندرت آفرین ماحول کے حصار سے باہر نہیں آ پاتا۔ ''چار آنکھیں'' کی شروعات دیکھئے کتنے ڈرامائی انداز سے کرتے ہیں۔

''آج میں ایک اعلان کرنا چاہتا ہوں جو اپنی جگہ ایک انکشاف بھی ہے اعلان یہ ہے کہ میری دو کی بجائے چار آنکھیں ہیں دو آنکھیں چہرے پر لگی ہوئی ہیں جو دیکھنے کے کام آتی ہیں جو سب کے سامنے ہیں اور صرف سامنے کے منظر دیکھتی ہیں اور ان کے تاثرات میرے ذہن کی صاف سکرین پر ریکارڈ کرتی رہتی ہیں۔''

قاری دوسری آنکھوں کو دیکھنے کے لیے انشائیے کی قرأت میں محو رہتا ہے اور پہلی دو آنکھوں کے انوکھے گوشوں اور نئے نئے زاویوں کو دیکھ کر حیرت آفرین مسرت سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔ انشائیہ جب نصف سے زیادہ فاصلہ طے کر لیتا ہے تو اس پر دوسری آنکھوں کا انکشاف بھی ہو جاتا ہے۔ ابھی وہ پہلی آنکھوں کے سحر سے باہر نہیں آتا کہ دو ان دیکھی آنکھوں کا سحر اسے اپنی طرف کھینچنے لگتا ہے جو پتھر کے تودے کے اندر چھپی ہوئی مورتی کے بھیتر چھپے ہوئے تودے کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور ان کو بے وجود اشیاء بھی نظر آنے لگتی ہیں۔

انشائیہ لفظوں کے اسراف کا متحمل نہیں ہو سکتا چنانچہ یہ کفایت لفظی کا تقاضا کرتا ہے۔ ایک اچھا انشائیہ نگار اس سے بخوبی واقف ہوتا ہے کہ انشائیہ کے بدن پر تفصیل کا ڈھیلا ڈھالا لباس خوش نہیں آتا وہ اسے مناسب اور برمحل لفظوں کا ایسا پیرہن پہناتا ہے جو اس کے جسم کی ضرورت کو بھی پورا کرتا ہے اور اس کے حسن میں اضافے کا باعث بھی بنتا ہے۔

انجم نیازی بھی اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں اور وہ اپنے انشائیے کو لفظوں کا ایسا لباس پہناتے ہیں جو اسے خوبصورت اور باوقار بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے موضوع کو

ڈھیلے ڈھالے جملوں کی پوشاک پہنانے کی بجائے کفایتِ لفظی کا موزوں اور دیدہ زیب لباس پہناتے ہیں جس سے ظرف اور مظروف دونوں کی توقیر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ''مدھ مکھیاں'' کا یہ پیراگراف دیکھئے جس میں کفایت لفظی بھی ہے اور اسلوب کی تازہ کاری بھی۔

''میں جب کوئی خوبصورت تحریر پڑھتا ہوں مجھے اس کا ہر لفظ شہد کی مکھی کی طرح دلکش دکھائی دیتا ہے ایسا لگتا ہے جیسے سفید کاغذ پر کئی شہد کی مکھیاں ایک ترتیب کے ساتھ قطار اندر قطار آ کر بیٹھ گئی ہوں اور ان کے منہ سے مفہوم کی بجائے شہد کا رس ٹپک رہا ہو۔ اس کے برخلاف ایسی تحریریں بھی دیکھی ہیں جیسے گوبر پر گندی مکھیاں منڈلا رہی ہوں اس قسم کی تحریریں مکھیوں کی طرح غلاظت پھیلاتی ہیں۔''

انجم نیازی الفاظ کے انتخاب کا گہرا شعور رکھتے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ کون سا لفظ تحریر میں کس مقام پر اپنا تاثر چھوڑتا ہے۔ سلیقے اور بے ساختگی سے لفظیات کے استعمال کی وجہ سے ان کی تحریر میں ایسی روانی پیدا ہو جاتی ہے جس کے بہاؤ میں قاری بہتا چلا جاتا ہے ان کی شگفتگی سے بھرپور، فکر سے معمور اور رواں دواں اسلوب سے مزین انشائیے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچے ہیں یہی وجہ ہے کہ انہیں اہل نظر کی نظر میں قابلِ تعریف مقام حاصل ہے یہ مقام انہوں نے دو چار برس کی محنت کے بعد نہیں بلکہ کئی دہائیوں کی مسلسل ریاضت کے بعد حاصل کیا ہے انہوں نے کم مگر بہت خوبصورت اور معیاری انشائیے تحریر کیے ہیں پروفیسر جمیل آذر ان کے انشائیوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''انجم نیازی کی گہری فکر و بصیرت حسین کرشمہ سازی کا حیرت انگیز نتیجہ ہیں ان کے انشائیے سننے، پڑھنے اور فکری انبساط حاصل کرنے کی دلآویز ترغیب دیتے ہیں اور ہمیں روزمرہ کے عام مظاہرات سے نکال کر ماورائی کیف و سرشاری سے روشناس کراتے ہیں۔''

☆☆..........

”مہر بہ لب رواں دواں“...... پر اظہار خیال

میری لائبریری میں ایک شعری مجموعہ ایسا بھی ہے جو مجھے بے حد عزیز ہے۔ اس مجموعے کی میرے دل میں جو قدر و منزلت اور احترام ہے۔ اُسے لفظوں کے بندھن میں باندھنا بے حد دشوار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ میر و غالب، مجید امجد اور فیض کے کلام کے ہم پلہ ہے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں۔ جھنگ کے معروف شاعر معین تابش کے اس مجموعے کا میرے دل میں اس لئے احترام ہے کہ انہوں نے یہ کتاب مجھے اپنی موت سے تین روز قبل ہیڈ کوارٹر ہسپتال جھنگ کے پرائیویٹ وارڈ کے ایک کمرے کے بستر پر پڑے ہوئے اپنے دستخط کے ساتھ اس وقت مرحمت فرمائی تھی جب موت کا فرشتہ ان کے اردگرد چکر لگا رہا تھا۔ میں نے ان سے گزارش بھی کی تھی کہ جب وہ تندرست ہو جائیں گے تو ان سے کتاب لے لوں گا مگر انہوں نے میری بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ (شاید انہیں اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اگر انہوں نے مجھے اس وقت کتاب نہ دی تو کبھی بھی نہ دے پائیں گے) اپنے بیٹے فصیح سے کتاب پر میرے بارے میں چند جملے لکھوائے۔ میرا سہارا لے کر نیم دراز ہو کر کتاب پر دستخط کیے اور میرے حوالے کر دی۔ میرا خیال ہے کہ وہ آخری کتاب تھی جس پر انہوں نے دستخط ثبت فرمائے تھے۔ وہ دستخط اس بات کا ثبوت ہیں کہ انہیں ادب سے اس درجہ لگاؤ تھا کہ مرتے دم تک اس سے اپنا تعلق بحال رکھا تھا۔ اس کتاب کا نام ”مہر بہ لب رواں دواں“ ہے۔ جو ان کی ایک نظم کا

مصرعہ ہے۔ ایک سو بارہ صفحات کا یہ مجموعہ زمانی اعتبار سے ان کی تیسری کتاب ہے مگر فنی لحاظ سے پہلی۔ اس سے پہلے ''دھول کے پیرہن'' اور ''شہر آب'' اشاعت پذیر ہو چکی تھیں۔ ان دونوں مجموعوں کا انہوں نے کڑا انتخاب کیا تھا۔ اس میں پینتیس چالیس سال پہلے والا کلام شامل نہیں کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر اور دیگر احباب کے پرزور اصرار پر انہوں نے اپنا پرانا کلام جمع کر کے ''مہر بہ لب رواں دواں'' کے نام سے شائع کر دیا تھا۔

معین تابش میں یہ خوبی رہی ہے کہ انہیں جو کام کرنا ہوتا ہے۔ اسے مؤخر کرنے کی بجائے فوری طور پر انجام دینے پر کمر بستہ ہو جاتے تھے۔ اگر وہ اس مجموعے کی اشاعت کا صرف منصوبہ بناتے رہتے اور عملی قدم نہ اٹھاتے تو یہ مجموعہ ان کی زندگی میں اشاعت پذیر نہ ہوتا اور بعد میں بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ کاغذی پیرہن پہن کر قارئین کے دست و دامن کی زینت بنتا۔ اس شعری مجموعے میں نظمیں، غزلیں اور قطعات ہیں۔ نظموں اور قطعات کی نسبت غزلوں کا پلڑا خاصا بھاری ہے۔ اس مجموعہ میں شامل کلام میں خیالات کی وہ گہرائی، لفظوں کا شکوہ اور تراکیب کی اس قدر کثرت نہیں ہے جو ان کے بعد کے کلام کے نمایاں اوصاف ہیں۔ اس کے باوصف ان کے پرانے کلام کی شریانوں میں جو خلوص، سادگی اور روانی رواں دواں ہے۔ نظروں سے اوجھل نہیں کی جا سکتی۔

پچیس تیس سال پہلے بھی جھنگ میں شعراء اتنی ہی کثرت سے تھے۔ جتنے کہ آج ہیں۔ اس وقت بھی ہر تیسرے چوتھے شخص پر شاعر ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ اکثر شعراء مبدا فیاض کے نہیں استاد شعراء کے مرہون تھے۔ جھنگ کے شاعروں کی گنتی میں اضافہ کرنے والوں میں معین تابش کا نام بھی شامل تھا۔ وہ اتنے فنافی الفن تھے کہ ان سے ہاتھ ملانے والے شخص کے اندر بھی شاعری کے جراثیم پیدا ہو جاتے تھے۔ یہ الگ بات

ہے کہ ان ''جراثیم'' کی مسلسل پرورش کی ذمہ داری بھی معین تابش ہی کو ادا کرنا پڑتی تھی۔

بڑے ادبی مراکز سے دور جھنگ جیسے دور افتادہ علاقے میں رہنے کے باوجود وہ ملکی اور غیر الاقوامی سیاسی، سماجی، معاشرتی اور معاشی حالات کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ غریب اور بھولی بھالی عوام کو استبدادی اور استحصالی قوتوں نے آکٹوپس کی طرح جکڑا ہوا ہے۔ جب تک ان کے حصار سے نکلنے کی جدوجہد نہیں کی جائے گی۔ مصائب و آلام کے تھپیڑے ان کا مقدر بنے رہیں گے۔ جبر و جور کے اس سلسلے نے عوام کو اس درجہ کمزور اور بے بس بنا دیا ہے کہ ظالم اور جابر لوگوں کے مقابل آنے کی بجائے سر تسلیم خم کر دینے ہی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔

اس طرح آندھیوں میں جھکے ہیں شجر تمام
جابر کے ڈر سے جیسے خمیدہ ہوں سر تمام

معین تابش کی زندگی کا زیادہ حصہ (خاص طور پر زندگی کا آخری دور) عسرت اور تنگ دستی میں بسر ہوا تھا۔ اپنی زندگی کی عکاسی اس شعر میں کتنی خوبصورتی سے کرتے ہیں۔

اکثر اوقات یہ محسوس ہوا ہے مجھ کو
زندگی لاشۂ بے گور و کفن ہو جیسے

وہ بڑے حوصلے والے تھے۔ تفکرات، ناکامیاں، نارسایاں اور غربت کے عفریت انہیں زیر نہ کر سکے۔ زندگی کو لاشۂ بے گور و کفن کہنے کے باوجود ان کی نظر ہمیشہ روشن مستقبل پر رہتی تھی۔ ان کا اس بات پر کامل اعتماد تھا کہ ایک روز روشنی کے تیشے ادبار کے تاریک پہاڑ کو پاش پاش کر کے تابندہ مستقبل کی نوید ضرور سنائیں گے اور وہ وقت دور نہیں ہے جب مجبور و مقہور لوگوں کے ہاتھوں میں خوشحالی کا پرچم ہوگا۔

اور مہماں ہیں چند لمحوں کے
یہ اداسی یہ ملگجے سائے

معین تابش نے یہ شعر عالم شباب میں کہا تھا۔

اک عمر بعد ہاتھ میں آیا تھا آئینہ
تابش میں اس کو، وہ مجھے پہچانتا رہا

اس وقت تک وقت کے چیتے نے ان کے چہرے پر خراشیں نہیں ڈالی تھیں اور زندگی کے سفر کی دھول صرف ان کے پیرہن تک پہنچی تھی۔ چہرے تک نہیں۔ جوانی میں ان کے اندر کا شاعر ان کے چہرے کو مستقبل کے آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ اگر بڑھاپے میں انہیں الجھنوں سے دامن چھڑوا کر آئینہ دیکھنے کی فرصت میسر آتی تو ان کا چہرہ چالیس سال پہلے کہے ہوئے شعر کی صداقت کی گواہی ضرور دیتا۔

معین تابش ایک مجلسی آدمی تھے۔ ان کی زندگی کا زیادہ حصہ انجمنیں اور شاگرد بنانے، محفلیں سجانے، مشاعرے منعقد کروانے اور احباب کو ہوٹلوں میں چائے پینے پلانے میں گزارا تھا۔ ریٹائرمنٹ سے قبل وہ بہت شہ خرچ رہے تھے۔ کبھی کسی ہوٹل میں بیٹھے دوستوں کو تکے کھلا رہے ہیں اور کبھی چائے اور سموسوں سے ان کی تواضع کر رہے ہیں۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد تنگ دستی کی وجہ سے گھر میں گوشہ نشینی اختیار کرنا پڑی۔ اس خلوت نشینی نے ان کے پرندِ خیال کی پرواز کو بلند کر کے ان کے کلام میں گہرائی اور نکھار پیدا کر دیا تھا۔ خلوت نشینی کے بعد وہ ''اوراق'' اور دیگر معیاری ادبی رسائل میں چھپنے لگے اور ان کی شہرت کا پنچھی جھنگ کی محدود فضا سے نکل کر ملک کے بڑے ادبی مراکز پر پرواز کرنے لگا۔ وہ ایک نظم میں کہتے ہیں۔

دل دھوپ کا صحرا ہے

اس دھوپ کے صحرا میں
تنہائی کا پہرا ہے

متعین تابش کتابوں میں پڑھی یا سنی سنائی باتوں کو شعری جامہ پہنانے کے حق میں نہیں تھے۔ جب تک کوئی واقعہ یا خیال براہ راست ان کے دل کے تاروں کو نہیں چھوتا تھا۔ وہ شعر نہیں کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام ندرت، روانی، تہ داری اور موثر ہونے کی کیفیت سے بھرپور ہوتا ہے۔ خون جگر سے تخلیق کیا ہوا کلام بے شمار دلوں کو متاثر کرتا ہے۔ وہ ایک شعر میں کہتے ہیں۔

ہے یہ منصب مرا اقلیم سخن میں تابش
دل پہ جو گزرتی ہے وہ لکھتے رہنا

معین تابش ایک حساس آدمی تھے۔ وہ معمولی باتوں کا بھی دل پر بہت گہرا اثر لیتے تھے۔ اگر کسی دوست کے منہ سے کوئی ایسا جملہ نکل جاتا جو ان کی طبیعت کے خلاف ہوتا تو وہ بہت بدمزا ہو جاتے تھے اور اس دوست کی شکایت اپنے تمام قریبی دوستوں سے کرتے تھے۔ بعض اوقات تو اس قدر گہرا اثر لیتے تھے کہ بیمار پڑ جاتے تھے۔ معذرت کے چند الفاظ انہیں بیماری کی دلدل سے نکال کر صحت یابی کی مسند پر بٹھا دیتے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ایک حساس آدمی کو مرنے کے لئے دار و رسن اور زہر کا زیر بار نہیں ہونا پڑتا، اسے مارنے کے لئے اس کے اندر کی حساسیت ہی کافی ہوتی ہے۔

کیا دار و رسن کیسی یہ زہراب کی باتیں
مرنا ہے تو تیشۂ احساس سے مرجا

یہ کتاب ترتیبی لحاظ سے تیسری مگر معنوی اور فنی اعتبار سے پہلی ہے۔ اس میں شامل سادہ اور سلیس کلام دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ بہت سے اشعار سہل ممتنع کی عمدہ مثال ہیں۔ امید واثق ہے کہ ان کا یہ مجموعہ ان کی شاعری کے ارتقاء کی نشان دہی کرتے ہوئے پہلے دو شعری مجموعوں کی طرح اہل فکر و نظر سے داد و تحسین حاصل کرے گا۔

............☆☆............

''نام میں کیا رکھا ہے'' پر ایک نظر

ڈاکٹر سلیم آغا کے انشائیے مطالعہ کی وسعت، مشاہدے کی گہرائی، فکر و خیال کی پختگی، طنز و مزاح، شگفتگی اور اسلوب کی تازہ کاری سے مزّین ہوتے ہیں۔ وہ کسی خیال، منظر یا چیز کے پیچھے چھپے ہوئے ایسے پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں جو عام نظروں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی ان کی گرفت میں نہیں آتے۔ انشائیہ ایک ایسی صنف ہے جس میں شگفتگی، تازگی، لطافت اور خوش طبعی کے ساتھ ساتھ فکر، فلسفہ اور سوچ بچار کی لکیریں ریل گاڑی کی پٹڑی کی طرح برابر فاصلے پر ساتھ ساتھ چلتی ہیں اگر ان کی موافقت اور مطابقت میں ذرا سا فرق بھی آجائے تو انشائیے کی گاڑی پٹڑی سے اتر جائے گی۔

سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں میں یہ دونوں لکیریں ابتداء سے انتہاء تک برابر فاصلے پر چلتی ہیں۔ ان کے انشائیوں میں ہی نہیں بلکہ پیراگرافوں میں بھی توازن کی یہ صورت برقرار رہتی ہے۔ انشائیہ ''کان'' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔ ''زندگی دراصل شور و شغف سے بھری پڑی ہے۔ آوازوں کے اس نقار خانے میں انسان کو کوہ ندا کی آواز سنائی تک نہیں دیتی۔ مگر جب زندگی کے کھیل کے آخری ایکٹ میں اس کے ''مادی کان'' بند ہونے لگتے ہیں تو اس کے روحانی کان کھل جاتے ہیں اور تب اسے وہ آواز سنائی دیتی ہے جو درحقیقت ایک ازلی و ابدی بلاوا ہے۔ یہ بلاوا محض زندگی کے سنگلاخ پہاڑ کو عبور کرنے کا بلاوا نہیں۔ اپنی ذات کے بھاری پتھر کو پار کرنے کی دعوت ہے۔''

اظہار ذات اور انکشاف ذات کا جذبہ ہر شخص میں موجود ہوتا ہے۔ ذات پات، رنگ ونسل، امارت، غربت اور زمان ومکان کے فرق کا اس جذبے پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اگر ان سے ایک قدم اور آگے بڑھایا جائے تو انکشاف ذات کا مرحلہ آجاتا ہے جو سراسر ایک صوفیانہ عمل ہے۔ اکثر انشائیہ نگار بالواسطہ طریقے سے اپنی ذات کا اظہار اس غیر محسوس طریقے سے کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو احساس تک نہیں ہوتا۔ جب انشائیہ نگار کسی شے، منظر یا خیال کے غیر اہم، معمولی اور حقیر پہلوؤں کو اہمیت، انفرادیت اور تشخص عطا کرتا ہے یا مسلمہ اقدار کی اپنی فنی بصیرت سے تردید کرتا ہے تو فی الاصل وہ اپنی ذات کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔ انشائیہ ذاتی اور انفرادی نوعیت کی صنف ہے۔ جب تخلیق کار انشائیے کے موضوع کو اپنے اندر اتار کر باہر لاتا ہے تو اس پر چڑھی ہوئی پرانی اور پا افتادہ تہیں اتر جاتی ہیں اور اس کے اصل نقوش (جو عام نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں) کاغذ کے صفحات پر ایک خوبصورت انشائیے کی شکل میں چم چم کرنے لگتے ہیں۔ داخلیت کا یہ عمل مجرد نہیں بلکہ اجتماعیت کا زائیدہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم آغا کے انشائیوں میں اظہار ذات اور تشہیر ذات کا یہ جذبہ جب انکشاف ذات میں تبدیل ہوتا ہے تو ان کی تحریر میں صوفیانہ رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ ان کا عقابِ تخیل جب اپنے موضوع پر گرفت کرتا ہے تو وہ اسے اپنے بھیتر کے سمندر سے اس وقت تک باہر نہیں لاتے جب تک کہ قطرۂ خیال گوہر آب دار میں تبدیل نہیں ہو جاتا۔ قطرے سے گوہر ہونے تک کا یہ عمل نفس کشی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ سلیم آغا قزلباش جب اس عمل سے گزر جاتے ہیں تو ان کے خیالات ایک معیاری انشائیے کا روپ پا لیتے ہیں۔ جس سے وہ خود بھی محظوظ ہوتے ہیں اور مطالعہ کرنے والے کو بھی اس راحت افزا فضا میں سانس لینے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ انشائیہ ''شرافت'' میں وہ ایک شریف آدمی کی

زندگی کی عکاسی کتنے منفرد انداز میں کرتے ہیں۔

''شریف آدمی تو سواریوں سے بھری زندگی کی تیز رفتار ریل گاڑی کی آخری بوگی کے باہر ہینڈل پکڑے جھولتا ہوا ایک ایسا شخص ہے۔ جو نہ تو بوگی کے اندر پاؤں رکھ سکتا ہے اور نہ ہی ریل گاڑی سے کود کر جان دینے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ ''ہونے نہ ہونے'' کے عین درمیان جھولتا رہتا ہے اور شرمندگی اور توہین کے تابڑ توڑ تھپیڑے کھاتا اپنے وجود کے پھڑ پھڑاتے بادبان کو سنبھال رکھنے کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہے تا آنکہ اس کا وقتِ رخصت آجاتا ہے اور ریٹائرمنٹ سے ہم کنار ہو کر باقی ماندہ زندگی گھر والوں کی خدمت میں گزارنے لگتا ہے۔''

سلیم آغا قزلباش کے انشائیے پڑھتے ہوئے ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم ''کھلے ڈھلے'' لباس میں بے تکلفی سے ڈرائنگ روم کے آرام دہ صوفوں پر نیم دراز انداز میں بیٹھے ان کی پر مغز اور شگفتہ گفتگو سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ ان کی گفتگو میں تکرار لفظی ہے نہ خطیبانہ انداز اور ناصحانہ فکر۔ وہ عمیق اور دقیق معانی کو اس بے تکلفی اور شگفتگی سے بیان کرتے ہیں کہ ان کے بیان کردہ فکر و فلسفہ کے تپتے ہوئے ریتلے صحرا سے گزرتے ہوئے ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خیابان سے گزر رہے ہوں۔ یہ ان کے قلم کا اعجاز ہی تو ہے کہ ان کی سنجیدہ باتیں ذہن پر بوجھ ڈالے بغیر ہمارے ذہن کو تحریک، دل کو روشنی عطا کر کے معانی کے نئے نئے ابعاد سے روشناس کراتی ہیں۔ وہ انشائیہ ''کھال کے صد رنگ'' میں لکھتے ہیں۔

''منافقت کی کھال پہن کر نت نئے کرتب دکھانا بیسویں صدی کے نمایاں کرتوت ہیں۔ اس کے لچھن بتاتے ہیں کہ وہ کھالیں کھینچنے میں بڑا لطف

لیتی تھی۔ اس نے عالمی پیمانے کی دو جنگیں اور متعدد علاقائی لڑائیاں لڑ کر نہ صرف اپنی جنگجویانہ فطرت کا پردہ چاک کر دیا بلکہ یہ بھی ثابت کر دکھایا کہ وہ بظاہر بھیڑ کی نرم و گداز کھال اوڑھے ہوئے تھی۔ مگر بباطن اس کے اندر ایک خون خوار بھیڑیا چھپا بیٹھا تھا۔ اوپر سے وہ ممناتی لیکن اندر سے غراتی تھی۔''

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کا قلم اکثر معمولی، حقیر اور کم تر اشیاء اور موضوعات کو چھوتا ہے (جنہیں اکثر ادباء غیر شاعرانہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں اور حاشیے پر جگہ دینے کے روادار بھی نہیں ہوتے) تو ان کے عقب میں مخفی پہلوؤں کو اتنی عمدگی سے منظر عام پر لاتے ہیں کہ ان میں نئی معنویت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس درجہ اہم بن جاتے ہیں کہ قابل ذکر اور اہم اشیاء اور موضوعات کے چراغ بھی ان کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں۔ اس ضمن میں انشائیہ ''چوہے'' پر ایک نظر ڈالیے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ چوہے رضا کارانہ طور پر تجربہ گاہوں میں اپنی قربانی دے کر انسانی زندگی بچانے کا مقدس فریضہ انجام دیتے ہیں مگر انسان اتنا احساس فراموش (خاص طور پر مشرق کے لوگ) ثابت ہوا ہے کہ ان کی اس قربانی کی تعریف کرنے کی بجائے اسے مطعون، ملعون، مردود اور مکروہ جیسے خطابات دے کر اپنی زندگی سے بے دخل کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا ہے مگر اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود چوہوں کے ساتھ رہنے پر مجبور ہے۔ مشرقی معاشرے کے برعکس۔

''مغربی دنیا چوہوں کی تاریخی اہمیت سے بخوبی واقف ہے اور اسے معلوم ہے کہ ماضی میں چوہے کا کردار بصورت ''بلیک ڈتھ'' کتنا گھناؤنا رہا ہے۔ مغرب کے ''کامک لٹریچر'' اور کارٹون فلموں میں چوہے کا وجود ایک لازمہ بن چکا ہے۔ وہاں یہ ''مکی ماؤس'' کے روپ میں معتوب اور کمزور طبقے کا نجات دہندہ اور محافظ بن کر نمودار ہوا ہے بلکہ چوہوں کی جہد مسلسل کا

اشاریہ بھی بن چکا ہے۔ اس سے چوہوں کی خود اعتمادی میں یقیناً اضافہ ہوا ہے ورنہ انہیں بھی کسی نہ کسی مؤرخ کی خدمت حاصل کرنے کی ضرورت پیش آتی جو "تاریخ موشاں" قلم بند کر کے ان کا نقطہ نظر واضح کرنے کی کوشش کرتا۔"

اگر قدرت ہاتھی جیسے جسیم الجثہ جانور کو عقل انسانی سے نوازتی تو وہ بھی چوہوں کی اس تعریف سے اپنے پہاڑ جیسے جسم کو گھٹا کر چوہے کی ننھی سی جسامت میں تبدیلی ہونے کی خواہش ضرور کرتا۔

بارگاہ انشائیہ میں طنز و مزاح کی باریابی ضروری نہیں ہے۔ اگر کسی انشائیہ نگار کے میلان طبع کے سبب سے یہ انشائیے میں داخل ہو جائے تو کوئی حرج بھی نہیں ہے مگر اپنی حدود سے تجاوز نہ کرے ورنہ انشائیے کے مزاج پر ایسے ہی اثرات چھوڑے گی جیسا کہ تیز و تند خوشبو کا اثر انسانی دل و دماغ پر ہوتا ہے۔

سلیم آغا قزلباش کے انشائیوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ طنز و مزاح اور شگفتگی سے مملو ہوتے ہیں مگر وہ انشائیے کے مزاج پر غالب نہیں آتے۔ انشائیہ "قصہ گردن کا" میں وہ اساطیری کہانیوں کے کرداروں (دیو، توتا، پنجرہ، شہزادہ، سبز یا لال پری) کے حوالے سے دور حاضر کے دیو استبداد جو بظاہر غریب عوام کی بہتری، بھلائی، خیر طلبی، خوش اقبالی اور آزادی کے سنہری لبادوں میں لپٹے ہوتے ہیں مگر اندر سے انہیں غلام بنانے کی تدابیر کرتے رہتے ہیں۔ سلیم آغا جب اپنی طنز کی تلوار سے ان لبادوں کو تار تار کرتے ہیں تو ان کی اصل صورت ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ جو بے حد بھیانک اور خوفناک ہوتی ہے۔ وہ یہ کام اتنی خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں کہ انشائیے کا استحقاق بھی مجروح نہیں ہوتا اور جمہوری قبا میں ملفوف دیو کا اصلی چہرہ بھی سامنے آجاتا ہے۔

''لیکن عصر حاضر کے دیو استبداد بڑے دور اندیش ہیں۔ وہ اپنی جان اور جان تمنا کو نہ صرف اپنی تحویل میں رکھتے ہیں بلکہ حفظ ماتقدم کے طور پر محافظوں کی نفری بھی بڑھا دیتے ہیں تا کہ ان کا دشمن ان کی گردن تک نہ پہنچ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے سرمایہ دار دیو ''آدم بو آدم بو'' کی گردان ترک کر چکے ہیں چونکہ اب وہ پوری طرح آدم شناس ہیں لہٰذا وہ اسے قرض دے کر اپنا زر خرید غلام بنانے کی روش پر گامزن ہیں اور جیسا کہ سب جانتے ہیں بھاری بھرکم قرض کا بوجھ اٹھانے کے بعد کوئی مائی کا لعل گردن کیا کمر بھی سیدھی رکھ کر چلنے کے قابل نہیں رہتا۔''

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کی اس کتاب ''نام میں کیا رکھا ہے'' میں شامل انشایئے ذہن کی آزاد ترنگ کے عمدہ نمونے ہیں۔ وہ گہرے خیالات کو شگفتہ اور لطیف الفاظ کا جامہ پہنا کر انشایئے کی شکل میں قارئین کو پیش کرتے ہیں تو وہ ان کے دلوں کو فرحت، ذہنوں کو بالیدگی اور نگاہوں کو کشادگی عطا کرتا ہے۔ امید کامل ہے کہ یہ انشائی مجموعہ پہلے دو مجموعوں سے بھی زیادہ پذیرائی حاصل کرے گا اور اُردو ادب میں بیش قیمت اضافے کا باعث بنے گا۔

............☆☆............

''صبح ہونے تک''......ایک مطالعہ

اردو افسانے نے اپنے آغاز سے اب تک کئی کروٹیں بدلی ہیں۔اس نے ایک کروٹ علامت نگاری کی بھی لی تھی۔اس کی ابتداء حقیقت پسند ادب سے ہوئی تھی۔ چنانچہ یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ علامتی افسانے کی سرحد روایتی افسانے کی قلمرو سے ملی ہوئی ہے۔ڈاکٹر انور سدید اس بارے میں لکھتے ہیں۔

''علامتی افسانہ جدیدیت کی اس رو سے متعلق تھا جو اظہار بیان کے نئے قرینے تلاش کر رہی تھی اور جس کا خمیر ترقی پسند تحریک کے سیاسی اور ادبی زوال سے تھا۔علامتی افسانہ روایتی افسانے کی طرح اکہرا نہیں بلکہ پہلو دار ہوتا ہے۔ اس کی بالائی سطح کے نیچے ایک اور حصہ بھی ہوتا ہے۔قاری کی جب اس تک رسائی ہو جاتی ہے تو اس پر افسانے کے نئے اور انوکھے زاویوں کا انکشاف ہوتا ہے جو نظر کو وسعت دل کو فرحت اور ذہن کو کشادگی عطا کرتے ہیں۔''

ابتداء میں علامت کا استعمال نہایت ہوش مندی اور سلیقے سے کیا گیا اور کئی زندہ رہنے والے افسانے تخلیق ہوئے۔بعد میں آنے والے افسانہ نگاروں نے کہانی کو غائب کر کے عسیر الفہم علامات کے ذریعے اسے اتنا دقیق بنا دیا کہ افسانے میں ''سہیلی بوجھ پہیلی'' والی کیفیت پیدا ہوگئی۔آٹھویں دہائی کے افسانہ نگاروں نے کہانی کی کمی کو شدت سے محسوس کیا اور ان کی کاوشوں سے کہانی دوبارہ افسانے میں داخل ہوئی تو جدید

افسانے کوتقویت بھی ملی اور قاری کا افسانے پر سے جو اعتماد اُٹھ گیا تھا وہ بھی بحال ہو گیا۔

نئے لکھنے والوں میں ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کا نام بہت نمایاں ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''انگور کی بیل'' بہت پہلے منصہ شہود پر آچکا تھا۔ اس کے آٹھ نو سال بعد ان کا دوسرا مجموعہ ''صبح ہونے تک'' 1995ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا تھا۔ ان دنوں ان کا دوسرا مجموعہ میرے دست و دامن کی زینت بنا ہوا ہے۔

سلیم آغا قزلباش نے افسانے کی قدیم روایت سے تعلق جوڑ کر جدید افسانے تحریر کئے ہیں۔ ان کے افسانے پڑھ کر حقیقت سے آشنائی بھی ہوتی ہے اور افسانے کے بطون میں چھپے ہوئے نئے معنی اور نئی حقیقت سے آشنائی بھی۔ ان کے افسانوں کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات کو دوسرے لوگوں کے قالب میں ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ایک عمدہ تخلیق کار وہی ہوتا ہے جسے دوسرے لوگوں میں زندگی بسر کرنے کا قرینہ آتا ہو۔ سلیم آغا قزلباش اپنے افسانے کو دقیق اسلوب اور خود ساختہ علامتوں کے ذریعے گورکھ دھندا بنانے کی بجائے فنکارانہ انداز سے ایسی گہرائی پیدا کرتے ہیں کہ ابلاغ کا مسئلہ جنم نہیں لیتا۔ وہ زندگی کی حقیقتوں اور معروضی صداقتوں کو اپنے قلم کی نوک پر لانے سے پہلے واقعات اور کرداروں کی بھیڑ میں اتر کر واقعات اور شخصیات کے ان مخفی گوشوں کو ہائی لائٹ کرتے ہیں جو عام مظاہر اور اشخاص کی صرف بالائی سطح تک خود کو محدود نہیں کرتا۔ وہ ان گوشوں تک بھی رسائی حاصل کرتا ہے جو زیریں سطح پر موجزن ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کے افسانوں میں انشائیے کا یہ پہلو بہت نمایاں ہے۔ معمولی واقعات سے غیر معمولی واقعات پیدا کرنا۔ افسانے کے پلاٹ کا اپنے کرداروں اور اس فضا سے ہم آہنگ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے اندر کا انشائیہ نگار بھی افسانوں میں موجود ہے۔ سلیم آغا قزلباش کی افسانے سے گہری وابستگی کا پتہ اس بات سے چلتا

ہے کہ وہ کرداروں کے مسائل و مصائب سے واقف ہی نہیں بلکہ ان کے دکھ درد میں برابر کے شریک بھی ہیں۔ ''پتلیاں''، ''دستکیں''، ''چڑیل'' اور بہت سے دیگر افسانوں میں اس کیفیت کو محسوس کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگار نے ان حالات و واقعات اور کرداروں کو اپنی روح کی گہرائیوں میں اتار کر انہیں افسانے کا روپ دیا ہے۔

سلیم آغا قزلباش ایک ایسے انشائیہ نگار ہیں کہ ان کے انشائیوں میں صرف مشاہدے کی گہرائی، فکر و خیال کی پختگی اور تازگی ہی نہیں ہوتی بلکہ ان کے اسلوب کی شگفتگی اور تازہ کاری بھی انشائیے کو قابلِ مطالعہ بناتی ہے۔ اسلوب کا یہ وصف ان کے افسانوں میں بھی موجود ہے۔ اس ضمن میں افسانہ ''اسیر'' کی ابتدائی چند سطور ملاحظہ کیجئے۔

''لال بھبھوکا سورج کسی وحشی کی طرح شام کی گلابی گردن میں اپنے دانت گاڑے اس کا لہو مسلسل چوس رہا تھا۔ جس سے شام کا نازک بدن خون کی کمی کے باعث مرجھانے لگا تھا۔ اب سیاہی کی چھاپ تیزی سے اس کے چہرے پر گہری ہوتی جا رہی تھی۔''

اگر کوئی افسانہ نگار ذہنی کشادگی، وسعت نظری، ژرف بینی، مطالعہ کی کثرت اور زندگی کے تجربات سے ہے تو وہ خارجی ماحول کی وساطت سے داخلی صداقتوں اور حقائق تک اپنی رسائی ممکن بنا سکتا ہے۔ ان اوصاف کی قلت کے باوجود ایک افسانہ نگار وقتی طور پر (جاہ و منصب اور دیگر ذرائع کے زور پر) تو اپنے نام کا جھنڈا اونچا کر سکتا ہے مگر اس پرچم کو زیادہ عرصہ تک سربلند نہیں رکھ سکتا۔ وقت کا سیلاب خس و خاشاک کی طرح اس کی تخلیقات کو اپنے ساتھ بہا کر لے جائے گا۔

سلیم آغا قزلباش نے اپنے افسانوں میں معاشرتی اونچ نیچ اور انسانی نفسیات

کونہایت عمدگی سے پیش کیا ہے۔ان کی حقیقت نگاری خارجی عوامل سے گزر کر داخلیت کے غار میں اتر جاتی ہے۔ان کے افسانوں کے کردار داخلیت اور خارجیت، کا حسین امتزاج اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔وہ نہ تو خارجیت کی مشین کا پرزہ بنتے ہیں اور نہ ہی داخلی کیفیت میں اس درجہ ڈوب جاتے ہیں کہ معاشرے سے کٹ کر جینے کی کوشش کرتے ہیں۔چنانچہ ان افسانوں میں نچلے طبقے کے مجبور و مقہور لوگوں کی زندگی کا ایک ایسا عکس نظر آتا ہے جو براہ راست دل پر اثر انداز ہوتا ہے۔افسانہ ''لال سینڈل'' کا آخری پیرا گراف ملاحظہ کیجیے۔

''اگلے دن صبح سویرے اس علاقے کی پولیس کا تھانیدار اور اونگھتے ہوئے دو چار سپاہی اپنی اپنی ناکوں پر ہاتھ رکھے سائیں بابا کے غلاظت سے لت پت جسم کو اپنے چمکیلے بوٹوں کی ٹھوکوں سے الٹ پلٹ رہے تھے۔گویا اس کی شناخت کررہے ہوں۔نازک ہیل والی سینڈل اس وقت بھی سائیں بابا کے دونوں ہاتھوں میں بری طرح پھنسی اس کے سینے سے چمٹی ہوئی تھی اور علاقے کے تھانیدار نے جھگیوں میں رہنے والوں پر گندی گندی گالیوں کی غلاظت بے تحاشا انڈیلنا شروع کردی۔سارا کا سارا گندا نالہ اب اس کے منہ سے بہنے لگا تھا اور بہتا ہی چلا جارہا تھا۔''

سلیم آغا قزلباش کا افسانہ ''صبح ہونے تک'' انسانی تاریخ اور تہذیب و معاشرت کے خیر و شر کے حوالے سے ایک ایسی کہانی ہے کہ بعض لوگوں نے اپنی بداعمالیوں سے اس خوبصورت دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔وہ اپنی بداطواری کی وجہ سے مختلف قسم کی مہلک بیماریوں کے حصار میں پھنسے ہوئے ہیں۔اس افسانے کی خوبی یہ ہے کہ سلیم آغا نے سائنس اور فلسفہ جیسے ادق مضامین کو اس خوبصورتی سے افسانے کا لباس پہنایا ہے کہ کسی

مقام پر بھی دلچسپی میں کمی نہیں آتی۔

افسانہ کھنڈر میں قدیم عمارت جو ہماری قومی ثقافت کی نشانی ہے۔ اس کے گرائے جانے پر اتنی دیر سے صدائے احتجاج بلند کی جاتی ہے کہ عمارت کے مضبوط وجود کا زمین سے معانقہ ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں لوگوں کی اپنے تاریخی ورثے سے بے اعتنائی دکھائی گئی ہے۔ افسانہ پڑھنے کے بعد مجید امجد کی نظم ''توسیع شہر'' ذہن میں گردش کرنے لگتی ہے۔ جس میں انہوں نے ایک سو پرانے درختوں کے بیس ہزار روپے میں فروخت ہونے کے بعد ان کے کٹنے کا منظر نہایت دردناک انداز میں بیان کیا ہے۔

''حصار''، ''تھوتھو'' اور ''چڑیل'' میں انسانی سائیکی کی بڑی کامیاب عکاسی کی گئی ہے۔ حصار میں ایک مختصر الوجود شخص ایک بڑے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود اپنی کوتاہ قامتی کی وجہ سے بہت پریشان رہتا ہے۔ جب وہ اس ذہنی اذیت سے نجات پانے کے لیے خود کو ختم کرنے کے لیے شہر کے ایک بلند مینار پر چڑھتا ہے اور اوپر سے نیچے کا منظر دیکھتا ہے تو وہ اشخاص اور اشیاء جنہوں نے اسے احساس کمتری میں مبتلا کر رکھا تھا نہایت حقیر اور کم مایہ نظر آتی ہیں۔ اس منظر کو دیکھنے کے بعد اس کی کایا کلپ ہو جاتی ہے۔

افسانہ ''تھوتھو'' میں حد سے بڑھی ہوئی ترتیب اور بے ترتیب کو معاشرہ پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتا اور بالآخر افسانے کے ہیرو کو مینٹل ہسپتال پہنچا کر دم لیتا ہے۔

''چڑیل'' میں بھی انسانی نفسیات کی نہایت عمدگی سے عکاسی کی گئی ہے۔

سلیم آغا قزلباش کے افسانوں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ان کے افسانے ابتداء ہی سے قاری کا دامن دل مضبوطی سے تھام لیتے ہیں اور یہ گرفت آخر تک بدستور قائم رہتی ہے۔ ''صبح ہونے تک'' کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے شدت سے محسوس ہوا ہے کہ افسانہ شروع کرنے کے بعد جب تک اس کا اختتام نہیں ہو جاتا ''آگے

کیا ہوا'' کی کیفیت سے میں باہر نہیں آپاتا۔ یہ ان کے فن کا کمال ہے کہ وہ جدید افسانوں میں بھی اساطیری کہانیوں کا سا ماحول پیدا کرکے انہیں اتنا دلچسپ بنا دیتے ہیں کہ اس طلسماتی فضا سے باہر آنے کو جی نہیں چاہتا۔

''صبح ہونے تک'' کے افسانوں کی تحریر پختہ، شگفتہ اور سلیس ہے۔ موضوع کے اعتبار سے سنجیدہ، فہمیدہ اور متین ہیں۔ افسانے پر پوری گرفت ہونے کی وجہ سے کہیں بھی جھول نظر نہیں آتا۔ سلیم آغا کے افسانوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بلاشبہ وہ نئی نسل کے ایک قدآور افسانہ نگار ہیں اور ان کا افسانوی مجموعہ ''صبح ہونے تک'' اردو افسانوی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

............☆☆............

جدیدیت سے پس جدیدیت تک

ناصر عباس نیرّ کو ادب و نقد کے میدان میں جواں سالی ہی میں وہ اہمیت اور شہرت حاصل ہوگئی ہے جو بہت سوں کو اپنی عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ صرف کرنے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتی۔ ان کے تنقیدی مضامین پاک و ہند کے تمام اہم رسائل وجرائد میں بڑے اہتمام سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ وہ ایک اعتدال پسند نقاد ہیں۔ بطور نقاد وہ ملک او ملک سے باہر اپنی شناخت بنا چکے ہیں۔ ان کی پہلی تنقیدی کتاب ''دن ڈھل چکا تھا'' تھی۔ جس میں ڈاکٹر وزیر آغا کی نظموں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ نامور نقاد اور فکشن رائٹر ڈاکٹر فہیم اعظمی نے لکھا تھا اور ناصر عباس نیر کی تنقیدی بصیرت کی داد دی تھی۔ اس کے بعد ان کے انشائیوں کی کتاب ''چراغ آ ریدم' منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کی بھی خوب پذیرائی ہوئی۔ متعدد وسائل میں اس کتاب پر تبصرے اور مضامین شائع ہوئے۔

ناصر عباس نیر جتنے اعلیٰ پایہ کے نقاد ہیں اتنے ہی خوبصورت انشائیہ نگار بھی ہیں۔ ان کا اسلوب منفرد اور دلکش ہے انشائیہ لکھتے وقت ان کے تنقیدی شعور نے بھرپور رہنمائی کی ہے اور انہوں نے بقول ڈاکٹر وزیر آغا زندہ جاوید انشائیے تخلیق کئے ہیں۔ (بحوالہ فلیپ چراغ آفریدم) متانت، تفکر، گہرائی اور نکتہ آفرینی ان کے انشائیوں کے نمایاں اوصاف ہیں۔

2000ء کے آخر میں ناصر عباس نیر کی تنقیدی کتاب "جدیدیت سے پس جدیدیت تک" کاروان ادب ملتان کے زیر اہتمام چھپی۔ پاک و ہند کے بہت سے نامور نقادوں نے (جن سے چند حروف لکھوانا اہل قلم اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے ہیں) اس کتاب کے بارے میں مضامین تحریر کئے جو رسائل و جرائد کی زینت بنے۔ "تخلیق" میں ڈاکٹر انور سدید نے "کاغذی پیرہن" میں، ڈاکٹر وزیر آغا نے "استعادہ" دہلی میں حقانی القاسمی نے ڈان کراچی میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے اور "نیشن" لاہور میں جمیل آذر نے مضامین تحریر کئے۔

جدیدیت سے پس جدیدیت تک تین حصوں پر مشتمل ہے حصہ اوّل میں نئی تنقیدی تھیوری پر بحث کی گئی ہے۔ حصہ دوم میں اُردو ادب کے پچاس سال کے حوالے سے اُردو تنقید اور خودنوشت سوانح پر ذو طویل مضامین پیش کئے گئے ہیں۔ حصہ سوم میں چند متفرق مضامین شامل ہیں۔ جن میں انشائیہ، ماہیا اور ناول کی شعریات پر منفرد انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ حصہ اوّل میں ساختیاتی تنقید لکھت لکھتی ہے لکھاری نہیں۔ ساخت شکنی کیا ہے؟ وزیر آغا کی امتزاجی نظریہ سازی۔ جدیدیت سے پس جدیدیت تک ایسے عنوانات ہیں جن پر قلم اٹھانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اُردو کے گنے چنے اہل قلم نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر فہیم اعظمی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، دیوندا سر اور چند دوسرے لوگوں نے ان نئے اور ادق موضوعات پر لکھا ہے۔ ان موضوعات پر لکھنے کیلئے وسیع مطالعہ اور گہرے تنقیدی شعور کی ضرورت ہے جو طویل مدت کی ریاضت کے بعد ہی انسان میں پیدا ہوتا ہے۔ حیرت آفرین بات ہے کہ ناصر عباس نیرّ نے جواں سالی میں نہ صرف اس غیر الفہم تھیوری کی تفہیم کی اور اس پر عبور حاصل کیا بلکہ اس کے متعلق منفرد انداز میں مضامین بھی تحریر کئے۔ جنہیں اہل نظر نے سراہا۔ ساختیات اور ساختیاتی تنقید کے ضمن میں انہوں نے مختلف

دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ساختیات نے ادب کو وسیع تر ثقافتی پس منظر سے منسلک کر کے ادب کے مطالعے کو نئی تنقید کے قائم کردہ دائرے سے آزاد کیا ہے اور ادبی متن کی شعریات کے حوالے سے انسانی ذہن کی آفاقی نوعیت کی کارکردگی کا احساس دلایا ہے۔

ساخت شکنی کیا ہے؟ ایک خیال آفریں مضمون ہے جس کے بارے میں تحریر کرتے ہوئے آزمودہ کار نقاد بھی اکثر ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ناصر عباس نیرّ نے ساخت شکنی کے تصور کو نہایت خوش اسلوبی سے آسان پیرائے میں بیان کیا ہے جو ان کے وسیع مطالعہ اور گہرے تنقیدی شعور کا غماز ہے۔انہوں نے اس ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا کے مطالعات اور نتائج سے اپنے مؤقف کو مضبوط بنایا ہے۔اس طرح انہوں نے قاری کی سوچ کو نئی راہیں دکھا کر اس کی نظر کو وسعت عطا کی ہے۔

ناصر عباس نیر وزیر آغا کی امتزاجی نظریہ سازی پر لکھتے ہوئے کہیں بھی افراط و تفریط کا شکار نہیں ہوئے۔انہوں نے بڑے متوازن انداز میں ڈاکٹر صاحب کے تمام نظریات کا نچوڑ احسن طریقے سے اپنے مقالے میں پیش کیا ہے۔وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''وزیر آغا نے خاص علمی انداز میں اس کا تجزیہ بھی کیا ہے۔انہوں نے ساختیات اور پس اختیار کا صرف تعارف ہی نہیں کروایا بلکہ اس کا تجزیاتی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔''

''جدیدیت سے پس جدیدیت تک'' ناصر عباس نیرّ کا ایک اور اہم مقالہ ہے۔جس میں انہوں نے اپنے مؤقف کے استحکام کیلئے ٹھوس دلائل وشواہد پیش کئے ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ مابعد جدید تنقید نے نظری تنقید اور ادب کی تھیوری پر زیادہ توجہ دی ہے اور اس کی قلم رد میں نہ صرف جدیدیت کے بعد اور جدیدیت کے رد میں پیدا ہونے والے تصورات شامل ہیں بلکہ کلچرل، سیاسی اور ماس میڈیا سے منتقل ہونے والی فضاء بھی عمل دخل رکھتی ہے۔(ڈاکٹر وزیر آغا نے اس مطالعے کے بارے میں مصنف کو اپنے خط میں لکھا جسے

کتاب کے آخر میں دیا گیا ہے)۔

''جدیدیت سے پس جدیدیت تک'' ایک خوبصورت تنقیدی مطالعہ ہے۔ میں اس بات پر حیران ہوں کہ تھیوری کے تعلقات پر آپ کی گرفت کتنی مضبوط ہے۔ اس موضوع پر لکھنے والوں میں سے بیشتر ابھی تک تھیوری کو پوری طرح سمجھ نہ پائے جبکہ آپ نے اس کے لطیف ترین پہلوؤں کو نہ صرف خوب سمجھایا ہے بلکہ اپنا نقطۂ نظر بھی مرتب کر لیا ہے۔ مضمون خوب بہت خوب ہے۔ اسے اوراق میں شامل کر رہا ہوں۔ ''اُردو کے تنقید کے پچاس سال'' اس کتاب کا سب سے طویل مقالہ ہے۔ جس میں انہوں نے نہایت عمق نظری سے اُردو تنقید کے پچاس سال کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ اس مقالہ میں گزشتہ پچاس برس میں اُردو تنقید میں نمو پانے والے جملہ اہم رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ناصر عباس نیرّ کا بنیادی ارتکاز فکری اور نظری مسائل پر ہے۔ اس مضمون میں ترقی پسند تنقید پر بہت سے اعتراضات کیے گئے ہیں۔ ناصر عباس نے ان اعتراضات کو منطقی انداز میں دلائل سے ثابت بھی کیا ہے۔ وہ ایک جگہ تحریر کرتے ہیں۔

ترقی پسندوں کی سماجی شخصیت کے اس ردعمل کو یکجا کرنا دراصل سماج کی منتشر قوتوں کو ایک نکتے پر مرتکز کر کے انقلاب کو ممکن بنانا تھا۔ یہاں تک اس نظریئے میں کوئی عیب نہ تھا۔ مگر جب ادیب کی تخلیقی شخصیت کو بھی خواہش انقلاب میں جھونکنے کی کوشش ہوئی تو ادب کو اس سے نقصان پہنچا۔

اس مقالے میں بھی مابعد جدیدیت کی تنقیدی فکر پر (جسے پس ساختیات بھی کہا گیا ہے) سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ مغرب ان نئے خیالات کو سامنے لانے میں اولیت کا درجہ ہرگز نہیں رکھتا بلکہ مشرقی ذہن ان سے صدیوں پہلے آگاہ تھا۔ تاہم مشرق کا خود مشرق سے تعارف تو مغرب کی وساطت سے ہوا۔

ساختیات اور پس ساختیات کی تفہیم اور توسیع کے سلسلہ میں ڈاکٹر وزیر آغا کی خدمت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وزیر آغا کے تنقیدی تصورات کی بدولت اُردو تنقید اب محض مغرب کی خوشہ چین نہیں رہی بلکہ اس سے اس سطح پر مکالمہ کرنے میں کامیاب ہوئی ہے اور یہ کوئی معمولی بات ہرگز نہیں۔

اُرد تنقید کے پچاس سال ناصر عباس نیرّ کا بھرپور اور مربوط مقالہ ہے جس سے ہر صاحب ۔وق قاری کا متاثر ہونا قدرتی امر ہے۔

ناصر عباس نیرّ نے اپنے مقالہ اُردو خودنوشت کے پچاس سال میں نصف صدی میں رقم کی جانے والی تمام اہم خودنوشت سوانح عمریوں کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اس مقالہ میں جہاں انہوں نے اُردو کے معروف اہل قلم کی خودنوشت سوانح کو شامل کیا ہے وہاں غیر معروف اد ، ں سے بھی صرف نظر نہیں کیا۔ اس مقالے کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اس میں آپ بیتی کے فن نے جو جو کروٹیں لی ہیں۔ ان کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ مقالہ جہاں اُردو آپ بیتی کے رجحانات کی تصویر پیش کرتا ہے وہاں اس فن لطیف کے اسلوبی و جمالیاتی امتیازات پر بھی روشنی ڈالی جاسکتی ہے اس مقالے میں وہ کسی تمام پر بھی جانب داری کا شکار نہیں ہوئے۔

ناصر عباس نیر کا مضمون ''ہنسی کیا ہے؟'' بہت خوب ہے اگرچہ یہ مضمون مختصر ہے مگر مطالعہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ مضمون مصنف نے وسیع مطالعہ کے بعد تحریر کیا ہے۔ ایک بڑے موضوع کو جامعیت کے ساتھ اتنی خوبصورتی سے پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے ملر انہوں نے اس مشکل کام کو احسن طریق پر انجام دیا ہے۔ یہ ایک علمی مقالہ ہے جو ہنسی کے مشرقی اور مغربی فلسفے کو معرض تحریر میں لاتا تھا۔ ناصر عباس نیر نے اس مقالہ میں

ہنسی کے مختلف مدارج کو انسانی تہذیب اور فکر کے مدارج سے مخروج کہا ہے۔ قہقہہ زور وحشت، مسکراہٹ دورِ تمدن اور تبسم زیرِ لب معرفتِ ذات کا آئینہ دار ہے۔

ناصر عباس نیر نے اپنے مقالے انشائیے کا تخلیقی عمل اور طنز و مزاح'' میں اس مغالطے کو دور کرنے کی سعی کی ہے کہ طنز و مزاح انشائیے کا لازم جزو ہے وہ طنز و مزاح اور انشائیے کا فرق واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''طنز و مزاح نگار سامنے کی مقبول اشیاء کا مذاق اُڑا کر قاری کو ہنساتا ہے جبکہ انشائیہ نگار اشیاء کے تصورات اور واقعات کے بطون میں اتر کر معنی کے اس عالم کا انکشاف اچھوتے انداز سے کرتا ہے جو ذہن انسانی کی وسعت کا سبب بنتی ہے۔ انشائیے کی قرأت سے لبوں پر مسکراہٹ آتی ہے جو طنز و مزاح اور انشائیے کا فرق واضح کیا [illegible]۔ انشائیہ نگاری کے بنیادی اصول بھی بیان کیئے گئے ہیں۔

اس باب میں شامل ناصر عباس نیر کا اگلا مضمون ''ماہیا اور اُردو میں ماہیا نگاری'' بھی قابل مطالعہ ہے۔ ماہیا پنجابی کی سہ مصرعی اور بعض کے خیال میں ڈیڑھ مصرعی صنف ہے اور تھوڑا عرصہ پہلے اُردو دان طبقہ نے اس کی طرف توجہ دی ہے۔ اس مضمون میں پنجاب کی ثقافت اور پنجاب کے رومان پرور ماحول کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے اور اس کی وساطت سے ماہیے کے خدوخال واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''ہندی گیتوں کی طرح ماہیے میں بھی اظہار عورت کی زبان سے ہوا ہے اور اس بات نے ماہیے کے مزاج پر گہرے اثرات مرتسم کیئے ہیں۔''

ماہیے میں چونکہ اظہار عورت کی زبان سے ہوتا ہے اس لئے عجز و انکساری اور مظلومیت کا اظہار ماہیے کے مزاج کا حصہ بن گیا ہے جس سے مشرقی عورت کے جذبات اور احساسات کا پتہ چلتا ہے اور معاشرے میں اس کے مقام کا تعین بھی ہوتا ہے اس

مقالے میں ناصر عباس نیرّ نے ماہیے کے متنازعہ مباحث جائزہ بھی پیش کیا ہے ان کے خیال میں چونکہ پنجابی میں مساوی الاوزان اور دوسرے مصرعے میں ایک سبب کم والے دونوں طرح کے ماہیے ملتے ہیں۔ اس لئے اس بات پر جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔ دراصل ماہیے کے ثقافتی مزاج پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ناصر عباس نیرّ کا مقالہ ''ناول کی شعریات'' ایک اور خیال انگیز کاوش ہے جس میں انہوں نے ناول کی ابتداء سے دور حاضر تک کے مسائل پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے انہوں نے ثابت کیا ہے کہ ناول کا زندگی سے بہت گہرا اور مضبوط سمبندھ ہے۔ ناول میں پیش کردہ زندگی اپنی فطری آزادی کے سبب اپنا راستہ خود ڈھونڈتی اور قدیم تعلقات سے ہٹ کر نئی قرابتوں اور صورتوں کا تجربہ کر کے ظاہر کرتی ہے کہ انسان اور کائنات کے رشتے میں زندگی کس قدر دھڑک رہی ہے نیر صاحب کے اس مقالے میں تخلیقی عمل کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ جو قاری کے علم میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے جمالیاتی ذوق کی تسکین بھی کرتی ہے اس کتاب کا آخری مقالہ اُردو ادب اور قاری ہے جس میں ادب کے قاری کے مسائل اور امکانات کا جائزہ لیا گیا ہے اور ادب سے قاری کی دوری کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے ناصر عباس نیر لکھتے ہیں کہ دور حاضر میں کتابیں دوستوں کو تحفے میں دینے کیلئے چھاپی جاتی ہیں۔ ان میں سے جو کتابیں لائبریریوں میں بھجوائی جاتی ہیں وہ دیمک کی خوراک کا کام انجام دیتی ہیں۔ ادبی رسائل صرف ان میں چھپنے والے ہی پڑھتے ہیں اور چھپنے والے بھی صرف اپنی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں بقیہ تخلیقات کو شجر ممنوعہ سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ ادب سے قاری کو دور کرنے میں شوبزنس کی چمک دمک، قاری کی ذہنی سطح کا بلند نہ ہونا، صنعتی کلچر اور میڈیا ایسے عوامل ہیں جن کی وجہ سے قاری کا ادب سے رشتہ کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ اکثر تخلیق کار قاری کو ادب سے دور ہوتا دیکھ کر بددل ہو جاتے ہیں جو ان کے تخلیقی عمل میں رکاوٹ کا سبب بنتا

ہے۔مگر سچا تخلیق کار تمام ترر کاوٹوں کے باوجود ایک درویشانہ استغناء کے ساتھ اپنے تخلیقی عمل کو نہ صرف جاری رکھتا ہے بلکہ اس کے شوق کا شعلہ مزید بھڑک اٹھتا ہے۔وہ نہ تو شوبز کے لوگوں کی وقتی چمک دمک سے مرعوب ہوتا ہے نہ ہی شہرت حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ تلاش کرتا ہے۔وہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہوکر تخلیقی وظیفے میں مگن رہتا ہے۔وہ شہرت کے حصول سے ہونیوالی مسرت سے بے نیاز ہوکر تخلیقی عمل کے دوران حاصل ہونے والی شادمانی میں ایسا شرابور ہوتا ہے کہ باقی تمام خوشیاں اس کیلئے ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔اس مقالے میں ناصر عباس نیر نے جدید نفسیاتی بصیرتوں کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ ادب کی تخلیق اور قرأت کا براہ راست تعلق انسان کی بنیادی اور ثانوی جبلتوں سے ہے۔اس لئے جب تک نسل انسانی باقی ہے نہ تخلیق ادب کا شعلہ سرد پڑ سکتا ہے اور نہ ادب کے مطالعے کی ضرورت دم توڑ سکتی ہے۔ڈیجیٹل ایج میں رسل ورسائل کے نئے ذرائع آئے ہیں۔انسان نہیں بدلا۔

بظاہر اس کتاب میں مختلف اور متنوع موضوعات پر مضامین شامل ہیں مگر غور کرنے سے بات کھلتی ہے کہ ان سب مضامین میں کئی باتیں قدر مشترک کا درجہ رکھتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مصنف نے تمام مضامین میں ادب کے نظری مسائل کو بالخصوص اہمیت دی ہے۔آج کل تنقید میں تھیوری کو بے حد اہمیت حاصل ہے اور ناصر عباس نیر اس بات سے آگاہ ہیں۔تاہم وہ تھیوری کی اہمیت کو محسوس کرنے کے باوجود ادب کی ادبیت اور جمالیات سے کسی مقام پر صرف نظر نہیں کرتے۔ادب کے کسی بھی پہلو پر لکھتے ہوئے وہ ادب کے اس تخلیقی عمل کو کسی لمحہ فراموش نہیں کرتے جس کی وجہ سے کوئی تحریر ادب پارہ بنتی ہے۔

............☆☆............

اصغر مہدی غزل کے آئینے میں

سید اصغر مہدی کا گھرانہ فن کاروں کا ٹھکانہ ہے۔ ان کی شریک حیات عذرا اصغر اردو کی نامور افسانہ نگار اور مدیرہ ہیں۔ پہلے ماہنامہ ''تخلیق'' کو خوبصورت اور معیاری تحریروں سے مزین کرتی رہیں۔ بعد ازاں اپنا رسالہ ''تجدید نو'' جاری کیا جو معیاری تخلیقات سے آراستہ ہو کر وقت مقررہ پر قارئین کی دست و دامن کی زینت بن رہا ہے۔ اصغر مہدی کے بیٹے عنبر تاجور افسانہ نگار ہیں اور ان کی بیٹی شبہ طراز آرٹسٹ بھی ہیں ،شاعرہ بھی ،افسانہ نگار اور مدیرہ بھی۔

اصغر مہدی صرف شاعر ہی نہیں عمدہ نثر نگار بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی شریک زندگی عذرا اصغر کا خاکہ ''گاڑی کا دوسرا پہیہ'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے جسے قارئین نے بہت پسند کیا اور ناقدین کے خیال میں فن خاکہ نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس خاکہ میں شخصیت کی صرف بیرونی سطح ہی پر روشنی نہیں ڈالی گئی بلکہ اس کے بطون کے جزیروں کو بھی ہائی لائٹ کیا گیا ہے۔ اگر اصغر مہدی خاکہ نگاری کی طرف سنجیدگی سے توجہ دیتے تو اچھے خاکہ نگاروں کی فہرست میں ایک خاکہ نگار کا اضافہ ضرور ہو جاتا۔

تقسیم ہند کے وقت ان کے خاندان نے منٹگمری (ساہیوال) جیسے پر سکون شہر میں سکونت اختیار کی۔ اس وقت ساہیوال میں منیر نیازی، اسرار زیدی، صابر کنجاہی

جعفر شیرازی، جمیلہ ہاشمی اور مجید امجد جیسے نامور شاعر اور نثر نگار موجود تھے۔ اس شہر سے ادبی رسائل بھی شائع ہوتے تھے۔ انہوں نے انشائیے بھی لکھے اور طنزیہ اور مزاحیہ مضامین بھی تحریر کیے۔ کافی عرصہ تک ریڈیو اسلام آباد کے لیے فیچرز بھی لکھتے رہے۔ ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ 2002ء میں ''اک عمر چاہیے'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا ان کا دوسرا شعری مجموعہ زیر طبع ہے۔ امید واثق ہے کہ بہت جلد کاغذی پیرہن سے آراستہ ہو کر قارئین تک پہنچ جائے گا۔

سید اصغر مہدی کی غزلیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام میں ایسے اشعار بکثرت ملتے ہیں جو معاشی، معاشرتی، سیاسی اور ذاتی نوحہ گری کا اظہار یہ ہیں۔ اس قسم کے مضامین کو بیان کرتے ہوئے تغزل کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ قاری کو کسی مقام پر بھی ناصح ہونے کا گمان نہیں ہوتا۔

ہے خون کا دباؤ کہ ماحول کا دباؤ
لحظہ بہ لحظہ بڑھتا ہے اعصاب کا کھچاؤ

زندگی نے خود پہ ہنسنا خوب سکھلایا مجھے
مرے ہنسنے سے لگایا تم نے اندازہ غلط

غم دوراں ، غم جاناں ،غم یاراں ، غم جاں
عمر گزری ہے یونہی کارگہ ہستی میں

اصغر مہدی لوگوں کے ریاکارانہ اور مکارانہ رویوں کی وجہ سے آبادیوں سے دور بیاباں میں بسنے کی آرزو کرتے رہے ہیں مگر خود کو بیاباں میں گم نہیں کرتے بلکہ بستیوں سے بھی

اپنا رشتہ برقرار رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ معاشرے سے تعلقات بالکل منقطع کر کے زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔ چنانچہ مردم گزیدہ ہونے کے باوجود مردم بیزار نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود کو بیاباں میں گم کرنے کی بجائے اس کے ساتھ ساتھ رہنے کی خواہش کرتے ہیں۔

لوگوں کے التفات سے تنگ آ کے بس گئے
آبادیوں سے دور بیاباں کے ساتھ ساتھ

اپنے خون جگر سے فن کو جلا دینے والے تخلیق کار ہر دور میں مادر ایام کی دختر ان الام کا شکار رہے ہیں۔ خوش حالی، شادمانی اور شاد کامی ہمیشہ ان سے گریزاں رہی ہے۔ خدائے سخن میر کہتے ہیں کہ ''پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں''

اردو غزل کو نئی کروٹ دینے والے منفرد لہجے کے شاعر غالب (جن کے دیوان کو عبدالرحمٰن بجنوری نے ہندوستان کی الہامی کتاب کہا تھا) عسرت و تنگ دستی اور ناقدر شناسی کی وجہ سے یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے ''کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں'' دوسرے تخلیق کاروں کی طرح اصغر مہدی کو بھی لوگوں سے یہ شکایت رہی ہے کہ اپنے خون جگر سے تخلیق کے عمدہ نمونے پیش کرنے والے تخلیق کاروں کی مالی حالت اس درجہ ابتر ہوتی ہے کہ وہ اپنی بنیادی ضرورتیں بھی پوری نہیں کر سکتے۔ رہوار تخلیق پر سوار ہو کر آسمانوں پر پرواز کرنے والے یہ تخلیق کار تنگ و تاریک گلیوں کے چھوٹے چھوٹے مکانوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔ اصغر مہدی کہتے ہیں۔

فن کاروں کا سرمایہ، کیا سرمایہ
پھٹے پرانے کپڑے، خالی الماری

وہ کہتے ہیں کہ اب ایسا دور آ گیا ہے جس میں فن کار کی کوئی قدر ہے نہ ہنر مند کو کوئی پوچھتا ہے۔ فن کار اور ہنر مند ہونے کے باوجود دو وقت کی روٹی مہیا کرنا ان کے

لیے مسئلہ بن گیا ہے۔

اب دور یہ آیا ہے کہ اس دور میں یارو!
دو وقت کی روٹی کو ترستا ہے ہنر مند

اصغر مہدی کے کلام میں تکرار لفظی کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ جس سے کلام میں ترنم اور روانی بھی پیدا ہوتی ہے اور کلام کا اثر بھی دو چند ہو جاتا ہے۔ الفاظ کی اس تکرار سے شعر کا سماعت پر خوشگوار اثر ہوتا ہے اور وہ کانوں کے راستے سے ہوتا ہوا دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔

پہلو پہلو ، دھڑکن دھڑکن
پھر اس خوش اندام کی باتیں
حسن کی منزل یکتا و یکتا، شوق غم جاناں سے چلو
عشق پریشاں تنہا تنہا جب بھی غم دوراں سے چلو

ہمارا معاشرہ اس ڈگر پر آ گیا ہے کہ مفلس و نادار لوگ خواہ کتنی ہی دانائی کی باتیں کریں ان پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ خالی ہاتھ دانائی کا اظہار کرنے والوں کو لوگ پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے بلکہ بڑے لوگ ان کی باتوں کا برا مان جاتے ہیں جبکہ بڑے منہ سے نکلی ہوئی چھوٹی بات پر بھی واہ واہ اور تحسین و آفرین کی بارش ہونے لگتی ہے اور ان کا شمار شہ پاروں میں کیا جاتا ہے۔

چھوٹے منہ سے اچھی بات بھی نکلے تو برداشت نہیں
اونچے منہ کی گھٹیا بات شمار کریں شہ پاروں میں

اصغر مہدی ابن الوقت قسم کے لوگوں کے بارے میں اپنی غزلیات میں بتاتے ہیں کہ ان لوگوں کے کردار اس قسم کے ہوتے ہیں کہ یہ لوگ ہر دور میں حاکم وقت کے منظور

نظر بن جاتے ہیں اور مفاد حاصل کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

کل بھی جو اخباری تھے ، سرکاری تھے، درباری تھے
آج بھی وہ محبوب ہیں، ان کے چرچے ہیں درباروں میں

آج ہم اس دور میں جی رہے ہیں جہاں عدل وانصاف عنقا ہو چکے ہیں۔ نزلہ ہمیشہ عضو ضعیف پر ہی گرتا ہے۔ دریا فصیل محل کے آگے تو سر جھکا کے چلتا ہے جبکہ اس کا بس کچے مکانوں پر بڑا چلتا ہے جو اس کے کٹاؤ میں آجاتے ہیں۔

اصغر مہدی دھان پان سے آدمی تھے۔ اس کے باوجود ان کے جسم میں غضب کی شکتی تھی۔ بڑے ہی باحوصلہ اور جرأت مند انسان تھے۔ زندگی بھر متحرک رہے ہیں۔ کاغذ اور قلم سے ان کا رشتہ زندگی کی آخری سانسوں تک برقرار رہا۔ دیکھیے اپنی جسمانی کمزوری کے بارے میں یہ ایک شعر میں کتنے خوبصورت انداز سے روشنی ڈالتے ہیں۔

ناراض ہو گیا تو لے آیا رقیب کو
اس کے مقابلے میں تو میں دھان پان تھا

اصغر مہدی کی غزلیں ان کے دل کی آواز ہیں۔ اس لیے وہ براہ راست دل میں اتر جاتی ہیں۔

............☆☆............

''باہر کا آدمی'' پر اجمالی نظر

اردو ادب میں غزل کے بعد افسانہ سب سے زیادہ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کا مضامین کے لحاظ سے دوسری اصناف سے میدان زیادہ وسیع ہے۔ ریت کے ذروں سے لے کر آسمان کے ستاروں تک ان گنت کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔ ژوف بین نگاہ اور تخلیقی ذہن انہیں لفظوں کا جامہ پہنا کر افسانے اور غزل کی شکل دے سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو افسانہ معیار اور مقدار کے لحاظ سے دوسری زبانوں کے افسانے سے کسی بھی لحاظ سے پیچھے نہیں ہے۔ افسانہ نگاروں کی اس کہکشاں میں حنیف باوا کا نام بھی شامل ہے۔

حنیف باوا کا نام پنجابی افسانے میں بہت معتبر ہے۔ ان کے افسانے پاک وہند کی کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ پنجابی ادبی بورڈ نے ان کے دو افسانوی مجموعے ''چرخے دی موت'' اور ''کہانی'' شائع کئے ہیں۔ تین دہائیوں سے وہ اردو افسانے اور انشائیے بھی تحریر کر رہے ہیں۔ ان کے انشائیوں کی کتاب ''دائروں سے باہر'' اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔ ان کے پنجابی افسانوں میں جو گہرائی، خلوص اور فنکارانہ چابکدستی نظر آتی ہے۔ وہ اردو افسانوں میں مزید نکھر کر سامنے آئی ہے۔ ''باہر کا آدمی'' ان کے اردو افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ جس میں چوبیس افسانے شامل ہیں۔ ان میں

چند علامتی افسانے بھی ہیں۔ انہوں نے علامت کو سہیلی بوجھ پہیلی نہیں بننے دیا۔ علامت کو اس ہوش مندی سے استعمال کیا ہے کہ وہ ابلاغ کی راہ میں رکاوٹ بننے کی بجائے معاونت کرتی نظر آتی ہے۔

حنیف باوا کی ساری زندگی مصائب و آلام اور تنگ دستی سے نبرد آزمائی میں گزری۔ وہ مضبوط اعصاب کے مالک ہیں۔ ژولیدہ حال ہونے کے باوصف نفسیاتی ژولیدگی کا شکار نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی اور افسانوں میں معتدل نظر آتے ہیں۔ تمام عمر غربت کے عفریت کا سامنا کرنے کی وجہ سے انہیں نچلے طبقے کی مجبوریوں، محرومیوں اور کٹھنائیوں کا بھرپور تجربہ اور احساس ہے۔ یہ مجبور اور مقہور لوگ استحصالی طبقے سے اس قدر مرعوب ہیں کہ خودی اور انا کا نام تک ان میں باقی نہیں رہا۔ گوشت پوست کے جیتے جاگتے انسان ہونے کے باوجود ان کا وجود اس طبقے کے سامنے خودکار کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ افسانہ "ایک تھا حاکم" ان لوگوں کے ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔

حنیف باوا کے افسانوں میں گھنیری زلفوں، یاقوتی لبوں، لانبی پلکوں، سرو قد، چمکدار دندان، نزاکت سے بل کھاتی کمر، آواز کا لوچ اور مستانہ چال کا ذکر نہیں ملتا۔ کیچڑ میں لتھڑا ہوا حسن، پھول سے کاندھوں پر سواری کرتے پتھر، محنت کش لوگ اور زندگی کے کھردرے راستے اور حقائق کے تپتے ہوئے صحراؤں کا ذکر ملتا ہے۔ افسانہ "سارنگی والا" میں ایک فنکار کی زندگی کو ہائی لائٹ کیا ہے۔ جو فن کی لذت میں اس درجہ سرشار ہے کہ سماجی اور معاشرتی پہلوؤں کو صرف نظر کر دیتا ہے۔ اس لئے اس کے گھر کی دیواروں پر غربت بال کھولے سو رہی ہوتی ہے۔ دفعتاً ایک روز وہ اپنی بیٹی کو دیکھتا ہے تو اس کے اندر اپنا فن زندہ رکھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے مگر جب اس کے بالوں کی سفید لٹ پر نظر

پڑتی ہے تو اس کی خواہش کا تاج محل ریت کے گھروندے کی طرح بکھر جاتا ہے اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلتا ہے۔

''نہیں تم میری بیٹی نہیں ہو'' اس کی بیٹی سفید لٹ کو دوپٹے کے نیچے چھپاتی اور چائے کی خالی پیالی اٹھا کر چلی جاتی ہے۔لڑکی کا خالی پیالی اٹھا کر لے جانا۔اپنے اندر گہری معنویت لیے ہوئے ہے۔

حنیف باوا کا اپنی دھرتی سے گہرا سمبندھ ہونے کی وجہ سے ان کی تخلیقات میں دیس کی مٹی کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔انہوں نے دو ڈبڈباتی آنکھوں میں انسانی رشتوں کی ناپائیداری اور اپنی زمین سے استقامت دکھائی ہے۔افسانے کا ہیرو جب بیرون ملک جاتا ہے تو تمام لوگوں کے چہروں پر اپنی اغراض کے لیبل چسپاں تھے مگر ایک ہستی ایسی بھی تھی جس کے چہرے پر خلوص و پیار اور آنکھوں میں آنسو تھے۔جب وہ ریاض کے ایک ہسپتال میں بستر مرگ پر پڑا موت اور زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا تو تمام چہرے دھندلے گئے مگر آنسوؤں سے بھرا چہرہ روشن اور تابندہ تھا۔وہ چہرہ اس کے وطن مالوف کا تھا جو اس کی موت کو سہل بنا رہا تھا۔

حنیف باوا ایک حساس انسان اور عمدہ تخلیق کار ہے۔وہ اس دنیا میں خلوص و محبت کی روشنی اور توافق اور توازن دیکھنے کا متمنی ہے۔وہ حرص و ہوا کے حصار میں پھنسے ہوئے لوگوں کو رواق محبت کے نیچے لا کر ان کی کایا کلپ کرنا چاہتے ہیں۔افسانہ ''پھول چہروں سے پھوٹتی روشنی'' میں ایک وہشت گرد اپنے ہاتھ میں بریف کیس اٹھائے پر رونق بازار میں داخل ہوتا ہے۔بچے کا بھولپن، برگد کی مصنوعی ٹہنی کی پاکیزگی اور فاختہ کی معصومیت کا اس کے دل پر اس درجہ اثر ہوتا ہے کہ معصوم لوگوں کو بچانے کے لیے ویرانے کی طرف تیزی سے دوڑنے لگتا ہے۔اندر کا انسان بیدار ہونے پر موت کا بھیانک خوف

دل سے نکل جاتا ہے۔

حنیف باوا اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہے اور اس کا ذہن موجودات عالم اور مظاہر فطرت کے بارے میں غور وفکر کرتا رہتا ہے۔اشیاء مناظر اور واقعات (جن کو ہم حاشیے پر جگہ دینے کے عادی ہیں) کے بطون میں اتر کران کی دوررس نگاہ اور فعال ذہن خام مال لاکر جب افسانے کے قالب میں ڈھالتا ہے تو ہمیں ان کی قوت مشاہدہ پر رشک آنے لگتا ہے۔

حنیف باوا کے افسانے چھوٹے اور کردار کم ہوتے ہیں۔اس وجہ سے انہیں اپنے افسانے پر پوری گرفت حاصل ہوتی ہے۔ان کے افسانوں کے کردار ہمارے اردگرد بسنے والے عام لوگ ہیں۔جن کی خوشیاں اور دکھ ہمارے سامنے ہیں۔اس لیے حنیف باوا کو ان کے باطن کے جزیروں کی سیاحت کے اکثر مواقع ملتے رہتے ہیں۔باوا صاحب کے افسانوں میں ان کی ذات کا کرب بھی موجود ہوتا ہے۔

حنیف باوا کا افسانہ ''باہر کا آدمی'' دراصل انسان کے اندر کا آدمی ہے۔جسے ہم دنیا کی گہما گہمی میں فراموش کر بیٹھے ہیں۔جب وہ اچانک سامنے آتا ہے تو ہم اسے باہر کا آدمی سمجھتے ہیں جو شخص لوبھ، کرودھ اور اختلال وانتشار کا شکار نہیں ہوتا اسے اندر ہی کا آدمی سمجھتا ہے۔اس کی باتیں اور حرکات بھی اس شخص کے لیے عسیر الفہم نہیں ہوتیں۔باہر کا آدمی (دراصل جو اندر کا آدمی ہوتا ہے) حس لطیف کا مالک ہوتا ہے اور اس دنیا کو امن کا گہوارہ بنانا چاہتا ہے۔

اس کتاب کے افسانے ''جوگ'' میں ان کا فن پورے عروج پر ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو دل کا سکون دنیا کو تج دینے سے نہیں بلکہ اس سے جڑے رہنے سے حاصل ہوتا ہے۔اس لیے گرو دیو کہانی کے ہیرو کو دھیان کی خوشبو سینچنے پر لگا دیتا ہے۔ جب تھکاوٹ کی وجہ سے اسے جسم کا رشتہ من کی دنیا سے ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے تو وہ گرو دیو

سے کہتا ہے: ''گرودیو مجھے جوگ چاہیے۔ میں نے بہت کشٹ کاٹ لیا ہے'' مگر گرودیو اسے صبر کی تلقین کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ابھی تک اس کا من لوبھ کرودھ سے پوری طرح صاف نہیں ہوا۔ چنانچہ وہ پھر سے دھیان کی خوشبو سینچنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ جب اس کی محنت شاقہ سے پھول اپنی خوشبو دھرتی کے باسیوں میں بانٹنے لگتے ہیں تو افسانے کے ہیرو پر شانتی کا بھید کھل جاتا ہے، گرودیو اسے کشٹ کاٹنے سے منع کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''تجھے جوگ دینے کا وقت آ گیا ہے'' جوگ دینے کے بعد اسے اپنی دنیا میں لوٹ جانے کی تاکید کرتے ہوئے کہتے ہیں ''آخری باران بچوں کے لیے گھوڑا بنتا جا جو برگد کے نیچے تیرا انتظار کر رہے ہیں۔'' دھیان کی خوشبو سینچنا اور گھوڑا بننا دو ایسے فعل ہیں جن کی وجہ سے ہیرو کا دنیا سے ناتا ٹوٹنے کی بجائے اور زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔

حنیف باوا کی کتاب کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اردو کے افسانوی ادب میں اپنی جگہ بنانے کی اس مجموعے میں صلاحیت موجود ہے۔

............☆☆............

''پیشِ نظر'' پر میری نظر

جذبۂ خودنمائی کائنات کی ہر چھوٹی بڑی شے میں موجود ہے۔ ایک طرف سر بہ فلک پہاڑ اپنی خودنمائی کے جذبے میں سرشار ہیں تو دوسری طرف چنبیلی کا ننھا سا پھول اپنی بھینی بھینی خوشبو سے اردگرد کی فضا کو معطر کر کے اپنے ہونے کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ آسمان پر سورج اور چاند کے علاوہ چھوٹے چھوٹے ستارے بھی ٹمٹما کر اپنی ذات کی نمائش کر رہے ہوتے ہیں۔ انسان بھی کائنات کا حصہ ہے چنانچہ وہ بھی کائنات میں جاری و ساری اس اصول کے تحت اپنی ذات کے اظہار کے لیے سرگرم عمل ہے۔ کبھی تو وہ اپنی ظاہری آرائش و زیبائش کے ذریعے خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی اپنی گفتگو اور تقریر کو مؤثر بنا کر دوسروں کی توجہ کا مرکز بننے کی سعی کرتا ہے۔ نوجوان طبقہ گاڑیاں تیز چلا کر عجیب و غریب لباس پہن کر، بال بڑھا کر اور نجانے کون کون سے حربے استعمال کر کے خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک شیر خوار بچے میں بھی یہ جذبہ موجود ہوتا ہے۔ نمود و نمائش کے یہ تمام ذریعے وقتی طور پر مسرت اور تسکین کا سبب بنتے ہیں۔ اس کے برعکس تخلیق کار اپنے خیالات، احساسات اور جذبات کو لفظوں کا حسین جامہ پہنا کر یا لکیروں کے ذریعے معیاری تصویر بنا کر اپنی شخصیت کا اظہار کرتے ہیں۔ جس کا دائرہ کار دوسرے ذریعوں کی نسبت بے حد وسیع بھی ہوتا ہے اور دیرپا

بھی۔ بعض اوقات یہ جذبہ انسان کو شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار تک پہنچا دیتا ہے۔ ایک تخلیق کار جب معاشرے میں رونما ہونے والے ناپسندیدہ واقعات اور ظلم واستبداد کو اپنی ذلمت کا حصہ بناتا ہے۔ تو اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری ہو جاتا ہے۔ وہ جب اس کرب کو خوبصورت لفظوں کا لباس پہنا کر صفحۂ قرطاس پر لاتا ہے تو ایک معیاری تخلیق پارہ تخلیق ہو جاتا ہے۔ جس سے فن کار کے اندر کی گھٹن لفظوں یا لکیروں کی شکل میں باہر آ جاتی ہے اور وہ شانت ہو جاتا ہے، تخلیق کار کو اس عمل سے بار بار گزرنا پڑتا ہے۔

شاعری اظہار کرب کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ جو اس کے اندر کی شکستگی کو (جو بیرونی ماحول کی زائیدہ ہوتی ہے) باہر لا کر باعث سکون بھی بنتی ہے اور اسے ناموری کا تاج بھی پہناتی ہے۔

صفدر سلیم سیال نے شاعری کو اپنے جذبات کے انخلاء کا ذریعہ بنایا۔ وہ طویل عرصے سے اپنے احساسات کا اظہار غزل اور نظم کے ذریعے کر رہے ہیں۔ ''فنون''، ''اوراق''، ''ادبیات''، ''تخلیق'' اور ملک کے دیگر ادبی رسائل میں طویل عرصے سے ان کا کلام اہتمام سے شائع ہو رہا ہے۔ مگر ان کا شعری مجموعہ بہت تاخیر سے شائع ہوا ہے۔ غزلوں کا مجموعہ جنوری 2007ء میں الحمد پبلی کیشنز لاہور نے ''پیش نظر'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ ان کی نظموں کا مجموعہ ابھی زیرِ طبع ہے۔ اس مجموعے کا دیباچہ 1992ء میں احمد ندیم قاسمی نے تحریر کیا تھا۔ جس کا اشتہار بھی ''فنون'' میں دو مرتبہ شائع ہو چکا تھا مگر اس کی اشاعت سے پہلے محشر بدایونی اپنا شعری مجموعہ اس نام سے شائع کر کے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ صفدر سلیم سیال کی سیاسی اور دیگر مصروفیات کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کتاب کا نام تبدیل کرنے میں پندرہ سال لگا دیئے۔ دیر آید درست آید، صفدر سلیم سیال اس دیری کی وضاحت ''پیشِ نظر'' کے ابتدائیہ

میں ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"اگر سچ پوچھیں تو سخت بے بسی کی حالت میں شعر کہتا ہوں علائق دنیا مجھے تقسیم کرتے رہتے ہیں اور میرا بہت سا وقت خود کو سمیٹنے ہی میں گزر جاتا ہے۔ اس میں دوسروں کا قصور نہیں میں خود اس کا ذمہ دار ہوں"

صفدر سلیم سیال شاعر بھی ہیں۔ سیاست دان اور زمیندار بھی مگر وہ اپنی ظاہری شکل و شباہت اور عادات و خصائل سے زمیندار نظر نہیں آتے ملکی سیاست میں عملی طور پر بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اس لیے وہ شاعری کی طرف اتنی توجہ نہیں دے پائے جتنی کہ دینی چاہئے تھی۔ دیر سے ان کا شعری مجموعہ آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ ایک دفعہ صوبائی الیکشن میں چند سو ووٹوں سے رہ گئے۔ الیکشن کے کچھ عرصہ بعد جب وہ شیر افضل جعفری سے ملے تو جعفری صاحب نے بڑی محبت سے انہیں گلے لگاتے ہوئے کہا تھا۔ "خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمارا شاعر اور دانش ور ہمیں لوٹا دیا۔"

صفدر سلیم سیال ایک ایسے شاعر ہیں جو غزل بھی خوبصورت کہتے ہیں اور ان کی نظم بھی عمدہ ہوتی ہے وہ اپنے شعر کے محل کے گیٹ پر فارسی اور عربی کے ادق لفظوں اور تراکیب کے دربان نہیں کھڑا کرتے کہ جن کی اجازت کے بغیر قصر میں داخل نہ ہوا جاسکے۔ وہ نہایت سلیس اور آسان زبان استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار خاص و عام میں یکساں مقبول ہیں۔ "پیش نظر" میں ایسے بہت سے اشعار مل جاتے ہیں جو پڑھتے ہی دل میں اتر جاتے ہیں اور نہایت سہولت سے حافظے میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اسی خوبی کی وجہ سے ان کے کئی اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔ جو گفتگو کو مؤثر بنانے اور تقاریر میں زور پیدا کرنے کے لیے حوالے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

ایک کتا کہہ رہا تھا اپنے ساتھی سے سلیم
بھاگ ورنہ آدمی کی موت مارا جائے گا

غور کیجئے محاورے میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے اتنا عمدہ شعر کہا ہے کہ موجودہ دور کی بھرپور عکاسی کا پرتو نمایاں طور پر اس میں نظر آتا ہے۔ چند اور اشعار ملاحظہ کیجئے:

گھومتا پھرتا ہوں گلیوں میں طبیعت کے خلاف
کسی دروازے سے شاید ترا چہرہ نکلے

اتنا مشکوک ہے انساں کہ جہاں رات پڑے
میزباں پہلے شرافت کی نشانی مانگے

تو نے بے وجہ کیا ترکِ تعلق ورنہ
ہم ترے ساتھ یونہی عمر گزارے جاتے

مت ٹوٹ کے چاہو اسے آغاز سفر میں
بچھڑے گا تو اک ایک ادا تنگ کرے گی

صفدر سلیم سیال جمال پرست انسان اور رومان پسند شاعر ہیں۔ جب وہ اپنے احساسات اور جذبات کو شعری پیکر میں ڈھالتے ہیں تو خوبصورت اشعار صفحہ قرطاس پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ جن میں ہجر و وصال اور خواب وخیال کی کیفیات کا ذکر نئے اسلوب میں ہوتا ہے مگر وہ اپنی انا کا اس درجہ خیال رکھتے ہیں کہ محبوب سے بھی برابری کی سطح پر تعلق قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر محبوب مہربان ہو کر بلائے تو وہ اسے گلے سے لگانے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں مگر اس ضمن میں پہل کرنا ان کی انا کے خلاف ہے۔

پلٹ پڑا تو اسے پھر گلے لگائیں گے
مگر یہ طے کہ اسے ہم پکارنے سے رہے

اس سلسلے میں وہ دوسروں کو بھی کہتے ہیں کہ محبوب اگر خودسر ہے تو میل ملاپ بڑھانے میں حد درجہ احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ اس میں خودداری کے خون ہونے کا

خدشہ اور انا کے ہاتھ سے جانے کا خطرہ ہر لحہ موجود ہوتا ہے اور انسان کو اپنی انا کے پرچم کو سرنگوں نہیں ہونے دینا چاہیے۔

خود سر ہے اگر وہ تو مراسم نہ بڑھاؤ
خوددار اگر ہو تو انا تنگ کرے گی

صفدر سلیم سیال آلام و ادبار سے دوچار ہونے، تنہائی کے جان لیوا عذاب سے گزرنے اور اپنے رگوں میں زہر نارسائی اتار کر جینے کو انا کے مجروح ہونے پر ترجیح دیتے ہیں۔

اپنی اپنی ضد نے ہم دونوں کو تنہا کر دیا
اک ذرا پیچھے ہٹا تو بھی نہیں ، میں بھی نہیں

ہم جی رہے ہیں اپنی انا کے حصار میں
اک زہرِ نارسائی رگوں میں اتار کر

میں بھی انا شکار ہوں ، وہ بھی انا شکار ہے
اپنے مقام سے مگر کوئی ابھی ہلا نہیں

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا سارا کلام رومان کے محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ وہ شعر کہنے کے علاوہ ملکی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیتے ہیں اور وہ ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر گہری نظر بھی رکھتے ہیں وہ آمریت اور حاکمیت کے خلاف تشبیہات، استعارات اور علامات کے پردے میں بالواسطہ اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتے بلکہ وہ بلا واسطہ اور بھرپور انداز میں بات کرنے کے قائل ہیں۔ اس امر کی وضاحت وہ اپنے ایک شعر میں یوں کرتے ہیں۔

کہنا پڑا تو ہم نے سرِ دار بھی کہا
لیکن کسی کو کچھ بھی پس در نہیں کہا

''پیش نظر'' کے 133 اور 144 صفحات پر آٹھ اشعار کی ایک قطعہ بند غزل درج ہے۔ جس میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کا بلند حوصلگی سے آمر کے سامنے اپنے مؤقف پر ڈٹے رہنے اور بالآخر پھانسی کے پھندے پر جھول کر جامِ شہادت نوش کرنے کے اندوہ ناک منظر کو دل نشین پیرائے میں شعری جامہ پہنایا گیا ہے۔ جس کا آخری شعر ہے۔

تجھ کو مرنا تھا تجھے موت تو آجانی تھی
دکھ تو یہ ہے ، ترا قاتل ترا درباری تھا

وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اس دورِ ناروائی میں زنجیر ہلانے اور فریاد کرنے سے انصاف نہیں ملتا۔ ہمتِ مرداں، جہد مسلسل اور جوانمردی سے خود کو مضبوط اور توانا کرنے ہی سے انصاف کی دیوی کے درشن کیے جاسکتے ہیں۔

خیرات میں کوئی تمھیں انصاف نہ دے گا
زنجیر ہلا کر کبھی فریاد نہ کرنا

زمیندار ہونے کی وجہ سے صفدر سلیم سیال کا زمین سے بہت گہرا سمبندھ ہے۔ اپنی زمینوں پر ان کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ دیہاتی ماحول، کھیت کھلیان، پگڈنڈیوں اور درختوں کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں۔ انہوں نے زمین سے اپنی محبت کا اظہار اشعار کی شکل میں بہت عمدگی سے کیا ہے۔ ''پیشِ نظر'' میں درختوں، کھیتوں اور مٹی کی خوشبو کا ذکر کئی مقام پر ملتا ہے۔

کوئی تو روکتا نیلام کرنے والوں کو
درخت چھاؤں بھی دیتے تھے بے ثمر بھی نہ تھے
دیکھتے ہی دیکھتے سب لے گئے جاگیردار
سرخ مٹی پر یہاں کل سینکڑوں کھلیان تھے

مٹی کی خطا تھی کہ خلل آب و ہوا میں
کیوں مغزِ شجر، ظرفِ ثمر میں نہیں آیا

علاوہ ازیں وہ ملک کی معاشرت، معیشت اور تہذیب و ثقافت سے بھی پوری طرح آگاہ ہیں۔ معاشرے میں دولت کی ناہموار تقسیم پر ان کا دل کڑھتا ہے اور برملا پکار اٹھتے ہیں۔

یہ سمجھ لو کسی طوفان کی آمد ہے سلیم
بہتے دریا سے اگر کوئی پیاسا نکلے

وہ موجودہ نظام تعلیم سے بھی مطمئن نظر نہیں آتے۔ اساتذہ اور طلباء دونوں تن آسان ہوگئے ہیں۔ وہ علم کی صحیح ترسیل کرنے اور زیورِ تعلیم سے آراستہ ہونے کی بجائے ایسے Shortcut کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جو بہت کم محنت سے امتحان میں اچھے نمبر دلا سکے۔

کس کو فرصت ہے نصابوں کے پڑھانے کی سلیم
اب کلاسوں میں پڑھانے کو خلاصہ رہ گیا

سیاست دان اور شاعر ہونے کی وجہ سے ان کا عوام سے قریبی رابطہ بھی رہتا ہے۔ ان کے دکھ سکھ میں شریک بھی ہوتے اور ان کے مسائل حل کرنے میں مدد بھی کرتے ہیں۔

ملے ہیں دکھ بھی بہت عزت و دوام کے ساتھ
تمام عمر گزاری ہے یوں عوام کے ساتھ

امید واثق ہے کہ ان کا یہ شعری مجموعہ اہل نظر قارئین کی نظروں میں محترم اور اردو ادب میں ایک عمدہ اضافہ ثابت ہوگا۔

............☆☆............

''گنجی بار'' پر طائرانہ نظر

اُردد کی بہت سی دیگر اصناف کی طرح افسانے کی تخلیق میں بھی خواتین مردوں کے شانہ بہ شانہ شریک رہی ہیں۔ بعض خواتین نے تو اس صنف میں اس درجہ شہرت حاصل کر لی ہے کہ افسانے کی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ مرد افسانہ نگاروں کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔ اُردو افسانہ نگاروں کی اس فہرست میں طاہرہ اقبال کی شمولیت کو بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا مگر انہوں نے بہت جلد اُردو افسانہ نگاری میں نمایاں مقام حاصل کرلیا ہے۔ ان کے پہلے مجموعے کا نام ''سنگ بستہ''، دوسرے کا ''ریخت'' اور تیسرے کا ''گنجی بار'' ہے جو اسی سال شائع ہوا ہے۔

''گنجی بار'' کے مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ طاہرہ اقبال کا مطالعہ وسیع، مشاہدہ تیز اور اپنے قلم پر پوری گرفت ہے۔ ان کی نظر اشیاء، مناظر اور کرداروں کے بطون میں اتر کر افسانے کا خام مواد حاصل کرتی ہے جو خوب صورت اسلوب میں ڈھل کر ایک معیاری افسانے کا روپ دھار لیتا ہے۔ ان کی ژوف بین نگاہ دل دریا سمندروں ڈونگھے پانیوں میں اتر کر انسانی سائیکی کے بیش قیمت اور انوکھے موتی اپنی مٹھی میں لاتی ہے اور خوب صورت لفظوں کے دھاگے میں پرو کر جب کہانی کا تانا بانا بُنتی ہے تو ایک عمدہ افسانہ صفحہ قرطاس پر چم چم کرنے لگتا ہے۔ عورت ہونے کے ناتے

انہوں نے صنف نازک کو بہت قریب سے دیکھا، پرکھا اور اس کی سائیکی کو سمجھنے کی حتیٰ المقدور کوشش کی ہے۔ بڑھتی ہوئی عمر کا عفریت مردوں کی نسبت عورتوں کے اعصاب پر زیادہ سوار ہوتا ہے۔ یہ احساس اس وقت اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے جب شادی کے بندھن میں بندھنے میں خاصی دیر ہو جاتی ہے۔ طاہرہ اقبال نے افسانہ ''لڑکیاں'' میں بتایا ہے کہ اس قسم کی خواتین اس عفریت سے بچنے کے لیے خود کو کس طرح فریب میں مبتلا رکھتی ہیں۔ افسانہ ''لڑکیاں'' کی یہ سطور ملاحظہ کیجئے۔

''لڑکیوں نے کئی بار ایک دوسری سے سوال کیا تھا۔ کبھی لڑکیاں بھی ریٹائر ہوتی ہیں۔ ریٹائر تو بڑھیاں ہوتی ہیں اور لڑکیاں کبھی بڑھیاں نہیں ہوتیں۔ بڑھیاں تو عورتیں ہوتی ہیں جو مائیں بنتی ہیں۔ نانیاں، دادیاں بنتی ہیں''۔

وجود زن سے تخلیق کائنات میں رنگ ہونے کے باوجود مشرقی معاشرے میں یہ خیال عام ہے کہ عورت کا وجود مرد کے بغیر ادھورا رہتا ہے۔ خاص طور پر نچلے طبقے کی خاتون اپنے وجود کی تکمیل اور اپنی شناخت کے لیے مرد کے تشدد کا نشانہ بنتی ہے۔ ظلم وستم برداشت کرتی ہے۔ خجل خوار ہوتی ہے اور ذلت برداشت کرتی ہے۔ اگر مرد نکھٹو ہے تو محنت مزدوری کر کے اپنے گھر کا چولہا گرم رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے باوجود اگر مرد دھتکارتا ہے تو گلی ڈنڈے کے کھیل کی طرح بار بار اس سے چرکے کھاتی اور ہر بار اس کے چرنوں میں پہنچ جاتی ہے۔ صرف ایک پیار کی خاطر۔ طاہرہ اقبال نے نچلے طبقے کی اسی عورت کی نفسیات کا جائزہ افسانہ ''روزن'' میں نہایت چابک دستی سے لیا ہے۔

''حرامی مار مار ادھ موا کر دیتا ہے۔ پھر پیار بھی تو ڈھیر سا کرتا ہے۔ مینا باجی اب میں اس کی مار پر مروں کہ پیار پر جیوں۔ باجی عورت ذات بھی بڑی کتی، مرد کی ذراسی شُشکار کے لیے کتنی خجل خواری سہ جاتی ہے۔ اس نیل کی

خاطر کتنے نیل اور زخم پی جاتی ہے۔ ویسے رب کو زنانی کے ساتھ یہ مرد کی پیار
والی کت نہیں لگانی چاہیے تھی"۔

دیہاتی طرز معاشرت اور تہذیب وتمدن کی عکاسی کرنے والوں میں پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، منشایاد اور بہت سے دوسرے افسانہ نگاروں کے نام بہت نمایاں ہیں۔ طاہرہ اقبال نے بھی اپنے افسانوں میں دیہاتی طرز زندگی اور کلچر کو ابھارا ہے۔ ان کے افسانوں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ دیہاتی طرز معاشرت کی تصویر کشی کرتے ہوئے دیہی لفظوں کے برش استعمال کرتی ہیں جس سے تصویر کے حقیقی نقوش واضح ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی قرأت کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خود اپنی آنکھوں سے وہ مناظر دیکھ رہے ہوں۔ دیہاتوں میں کچے کوٹھے، جھونپڑیاں، جھگیاں، مرغوں کی دڑبے، چرخوں کی گھوکر، لسی کی چاٹیاں، مکھن کے پیڑے، بھیڑ بکریاں، بھینسیں اور رنگین مدھانیوں کی آوازیں عام ہوتی ہیں جن کی عکاسی وہ افسانہ "گھم گھم مدھانی" میں یوں کرتی ہیں۔

"ہر حویلی ڈیرے، جھگی، جھونپڑی سے مرغوں کی بانگیں، دڑبوں اور ٹوکروں میں گھسی پھنسی نکلتی تھیں اور مدھانیوں کی ہلکی بھاری آوازوں میں ہم آمیز ہو گئی تھیں گدھے رات کے آخری پہر کا اعلان اپنے آخری اور چوتھے ہنگنے میں کر چکے تھے اور ساری ساسیں لسی سے بھری چاٹی کے کھلے منہ پر مکھن سے لتھڑے ہاتھ رگڑ رگڑ کر مکھن جمع کرتی تھیں اور ساری بہویں اوپلے تھاپتی اور آنسوؤں کے پانی سے انہیں بھگوتی تھیں۔"

طاہرہ اقبال نے دیہات کے نچلے طبقے کی نفسیات کا مطالعہ و مشاہدہ عمیق نظروں سے کیا ہے اور ان کے مسائل و مصائب سے بہ خوبی واقف ہیں۔ یہ نچلے طبقہ کے

روندے ہوئے وہ لوگ ہیں جنہیں زمین دار اور خوش حال لوگ کمی کمین کہتے اور زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑے سمجھتے ہیں۔ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے مگر اس کے باوجود ان کی وفاداریوں میں فرق نہیں آنے پاتا۔ بے عزتی برداشت کرتے ہوئے ان کی پیشانی شکن آلود نہیں ہوتی۔ان کی حمیت اور غیرت کسی دور دراز کے گم نام جزیرے میں گہری نیند سوئی ہوتی ہے۔وہ موٹی موٹی غلیظ گالیاں کھا کر بھی بے مزہ نہیں ہوتے۔گالیاں اور ٹھڈے کھا کر بھی دانت نکالتے رہتے ہیں۔غربت اور ناسازگار حالات نے انہیں اس قدر بے حس کر دیا ہے کہ وہ عزت اور غیرت کے لفظوں سے بھی ناآشنا ہو گئے ہیں۔ان کی عورتیں بھی اپنے مردوں کی طرح ذلت آمیز لہجے اور ناروا سلوک کی عادی بن چکی ہیں ان پر بھی دشنام کے تیر و تفنگ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بے عزتی کے ہر تیر کو وہ اپنے سینوں میں ہنس کر اُتار لیتی ہیں اور زبان پر حرف شکایت تک نہیں لاتیں۔طاہرہ اقبال افسانہ ''پکھی'' میں رقم طراز ہیں۔

''مراثنیو! تمھیں کبھی جڑا ہو تو پتا ہوتا۔گندی مشک والیو پیر نہ رکھنا۔دیکھو تو مٹی گوہے سے بھرے ہوئے۔جوویں تمہاری دھوتیوں میں چلتی ہیں۔میرا کوٹھا نہ ترکاؤ، جاؤ پکھیوں میں جا بیٹھو''۔

طاہرہ اقبال نے اپنے افسانوں میں سیاست دانوں اور لیڈروں کے چہروں پر پڑے ہوئے ریاکاری، منافقت اور مکاری کے نقابوں کو اٹھانے کی کوشش کی ہے۔اکثر لیڈر غریب عوام کے ساتھ ہم دردی، بہی خواہی، غم خواری اور ان کے روشن مستقبل کے دعوے کرتے ہیں اور اپنی اداکاری اور فسوں کاری کے ذریعے سادہ لوح لوگوں کو فریب دیتے رہتے ہیں۔ایسے لیڈر قوم کے غم میں ڈنر کھاتے اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ایسے نام نہاد لیڈر غریب لوگوں کے خون کے عوض وزارت کی کرسی حاصل

کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں سمجھتے۔ طاہرہ اقبال نے افسانہ ''عرفی'' میں اس قسم کے ایک لیڈر کے اصل چہرے کو بے نقاب کیا ہے جو افسانے کے ہیرو ساجد کی موت کا انصاف دلانے کے لیے جلسے کرتا اور جلوس نکلواتا ہے۔ جلسوں اور جلوسوں میں ''ظالمو! جواب دو خون کا حساب دو'' کے فلک شگاف نعرے لگواتا ہے۔ اس کے طرزِ عمل سے غریب لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ ان کا سچا ہمدرد اور بہی خواہ ہے مگر چند روز کے بعد اخبارات کے صفحات سے ساجد کے خون کی خبر غائب اور اخبارات کے پہلے صفحات پر اس نام نہاد لیڈر کی رنگین تصاویر چھپی ہوتی تھیں جو ایک جگہ وزارت انصاف کا حلف اٹھا رہا تھا اور دوسرے مقام پر ایک تقریب میں این جی او کے نئے فلاحی پروجیکٹ کے افتتاح کا فیتہ کاٹ رہا تھا۔

اُردو زبان بید کی شاخ کی طرح بے حد لچک دار ہے۔ دوسری زبانوں کے لفظوں کو اپنے اندر سمونے اور اپنانے کی اس میں بے حد لیاقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں نت نئے لفظوں کے اضافے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ دوسری زبانوں کی طرح پنجابی کے ان گنت لفظوں کو اپنے اندر ضم کرنے اور انہیں اپنا بنانے کا سلسلہ عرصہ دراز سے جاری ہے اور روز بہ روز اس عمل میں تیزی آتی جا رہی ہے۔ جیسا کہ اُردو شاعری میں پنجابی کے لفظوں کے بہ کثرت استعمال کی وجہ سے شیر افضل جعفری کی ایک خاص پہچان بن گئی ہے۔ اُردو افسانے میں بھی پنجابی کے الفاظ کا استعمال نیا نہیں ہے۔ بہت سے افسانہ نگاروں نے بے تکلف پنجابی کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ طاہرہ اقبال نے زیادہ افسانے دیہی پس منظر میں رقم کیے ہیں۔ شیر افضل جعفری کی طرح انہوں نے بھی اپنے افسانوں میں پنجابی کے الفاظ کثرت سے استعمال کیے ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں تو پنجابی الفاظ کی بھرمار تھی مگر آہستہ آہستہ اس میں کمی آتی گئی اور ''گنجی بار'' کے

افسانوں تک اس استعمال میں ایک توازن پیدا ہوگیا ہے۔ طاہرہ اقبال نے اپنے افسانوں کی زبان پر خاص توجہ دی ہے۔ وہ اسے خوب نکھارتی اور سنوارتی ہیں۔ انہوں نے اردو افسانے کی شال میں پنجابی الفاظ کے موتی اس خوب صورتی، مہارت اور سلیقے سے ٹانکے ہیں کہ جس کی وجہ سے شال کی شان میں بھی اضافہ ہوا ہے اور پنجابی لفظوں کو اردو کے محل میں داخل ہونے کے مواقع بھی میسر آئے ہیں اور یہ مواقع آئندہ بھی انہیں ملتے رہیں گے۔ ''گنجی بار'' کے افسانوں میں پنجابی کے لفظوں کو کس مہارت سے استعمال کیا ہے ملاحظہ کیجئے:

''وہی مجلی کا ٹوٹا دن میں کمر سے باندھے، رات میں بدن گٹھڑی لپیٹے شاید اس کا پردہ کج ''سارے اپنے اپنے پرنوں کو کندھوں پر جھٹک مڑ جاتے''۔

''مرد مونچھیں باچھوں پر گرا کر سرک گھرک سوٹے کھینچنے لگے اور چاچے کا سرِ گٹھ (بالشت) برابر اونچا ہوگیا''۔

''اگلے دن روڑوں والے کِلے (ایکڑ) میرے نام کیے اور ساری برادری میں شملہ اونچا کر کے کہا:

''چوہدری یہی تین چار سال کا اوجھلا تو ہے جس کے اوہلے (اوٹ) بچہ جوان ہو جاتا ہے''۔ نہ پُت (بیٹا) تیرا باپ تو ازل سے زہری! پر ماں کا خیال کر تیرے باجھوں (بغیر) مچھی ہار تڑپ تڑپ کر مر جائے گی''۔

طاہرہ اقبال کے افسانے ہمارے اردگرد کے ماحول کے عکاس ہیں۔ انہیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اور ہمارے دوست، عزیز واقارب، بال بچے، ڈھور ڈنگر اپنے محلوں، بازاروں اور گلی کوچوں میں ایک دوسرے کو محبت کی آنکھ سے دیکھتے پھر رہے ہوں۔ ڈاکٹر انیس ناگی ان کے افسانوں کے بارے میں لکھتے ہیں

''طاہرہ اقبال کے افسانے حقیقت نگاری کے اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ان کے افسانوں کا خمیر آج کی دنیا سے اٹھتا ہے''۔

میں نے اپنا ذاتی سفر افسانے سے شروع کیا تھا۔پچاس پچپن افسانے تحریر کئے تھے جو مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے تھے۔گزشتہ دس گیارہ برس سے میں خاکہ، انشائیہ، مضمون اور غزل کے حصار میں ایسا محصور ہوا کہ اس دوران میں کوئی افسانہ تحریر نہ کرسکا مگر ''گنجی بار'' کے مطالعہ کے بعد میرے اندر افسانہ لکھنے کی تحریک پیدا ہو رہی ہے شاید کچھ عرصے کے بعد افسانہ لکھنے میں کام یاب بھی ہو جاؤں۔یہ طاہرہ اقبال کے افسانوں کی کرامت ہی تو ہے کہ میرے اندر افسانے کی طرف مراجعت کرنے کی تحریک پیدا ہو رہی ہے۔

............☆☆............

''خیالی پلاؤ'' پر ایک نظر

اردو انشائیے کی عمر تقریباً پینتالیس سال ہے۔ نصف صدی سے بھی کم عرصہ کسی ادبی صنف کے لئے نہایت قلیل ہوتا ہے۔ مگر انشائیے کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اس نے مخالفت کے باوجود اتنے مختصر سے عرصہ میں نہ صرف اپنے وجود کو تسلیم کروایا بلکہ اردو ادب کی دیگر نثری اصناف کے ساتھ نہایت اعتماد سے قدم ملا کر چل رہا ہے اردو ادب میں اس صنف کو متعارف کروانے اور ترویج دینے والے ڈاکٹر وزیر آغا ہیں۔ 1966ء میں جب ''اوراق'' کا اجراء ہوا تو پروفیسر جمیل آذر کا ''پکنک'' اور مشتاق قمر مرحوم کا انشائیہ ''چھتری''، ''اوراق'' کے پہلے شمارے کی زینت بنے۔ بعد میں اس کاروان انشائیہ میں آہستہ آہستہ لوگ شامل ہوتے گئے جن میں ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، سلیم آغا قزلباش، اکبر حمیدی، بشیر سیفی، محمد اسد اللہ، سلمان بٹ، پرویز عالم، رعنا تقی، حیدر قریشی اور راغب شکیب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ ''خیال پارے'' 1961ء میں منصہ شہود پر آیا۔ جس کے دیباچے میں مولانا صلاح الدین احمد نے یوں اظہار خیال کیا ہے۔ ''مجھے اس بات کا یقین ہے کہ مصنف نے ادب کی اس نئی پگڈنڈی پر جو چراغ روشن کیا ہے اس کی جھلملاتی ہوئی روشنی میں ہمارے نئے لکھنے والے اور آگے بڑھیں گے اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اپنے اپنے

چراغ اسی طرح رکھتے جائیں گے۔

صلاح الدین احمد کی پیش گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ شدید مخالفت کے باوجود وزیر آغا کے چراغ سے وقفے وقفے سے اتنے چراغ روشن ہوئے کہ آج چراغوں کا ایک طویل سلسلہ نظر آتا ہے۔ جس نے انشائیے کی راہوں کو بقعہ نور بنا دیا ہے۔ اور ان کی تعداد میں اضافے کا عمل جاری ہے ادب کی پگڈنڈی پر روشن کیے گئے چراغوں میں عبدالقیوم کے انشائیوں کا مجموعہ ''خیالی پلاؤ'' کے شامل ہونے سے نہ صرف ان کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے بلکہ ان کی روشنی نے اس راہ کو مزید منور کر دیا ہے۔ وہ گزشتہ پندرہ برسوں سے انشائیے تحریر کر رہے ہیں۔ ان کے انشائیے ملکی اور غیر ملکی ادبی رسائل میں باقاعدگی سے شائع ہو رہے ہیں۔ انہیں اپنے موضوع سے والہانہ لگاؤ اور گہرا قلبی تعلق ہے۔ وہ سامنے کے موضوع کو جب انشائیے کے قالب میں ڈھالتے ہیں تو اس پر سے گھسے پٹے، پرانے اور فرسودہ خیالات کی پرتوں کو اتار کر اس کے عمق میں پوشیدہ نئے اور اچھوتے خیالات کو قلم کی نوک پر لا کر خود بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور قاری کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ ڈائری لکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اپنی زندگی میں پیش آنے والے روزہ مرہ کے واقعات کو وہ نہایت دیانتداری سے قلم بند کر رہے ہیں اور کوئی بات بھی پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کرتے مگر عبدالقیوم ان لوگوں سے اتفاق نہ کرتے ہوئے اپنے انشائیہ ''ڈائری'' میں کہتے ہیں۔

''یہ بات تو کسی حد تک طے ہے کہ ذاتی ڈائری میں سچائی کی مقدار کو کتنا سمویا جائے۔ لیکن وہ مکمل طور پر سچائی کو ظاہر نہیں کرتی کہ انسان اپنے کردار کی کمزوریوں کے ہاتھوں اپنے بارے میں مکمل دیانتداری سے کم کام لیتا ہے۔ وہ اپنی خود پسندی کی عمارت میں دراڑیں ڈالنے سے سہا سہا رہتا ہے۔ سچ تو یہ

ہے کہ انسان اپنے سوا کسی پر مکمل طور پر نہیں کھلتا۔ حتیٰ کہ اپنی ڈائری میں بھی نہیں۔''

عبدالقیوم اس جہان کو عام لوگوں کی طرح سرسری دیکھ کر نہیں گزر جاتے انہیں ہر قدم پر جہانِ دیگر نظر آتا ہے۔ چنانچہ وہ معمولی سے معمولی شے کو بھی گہری نظر سے دیکھتے ہیں اور ان میں پوشیدہ نئے اور حیران کن گوشوں کو لا کر انہیں جھاڑ پونچھ کر لوگوں کو دکھاتے ہیں تو ان کی ژرف بینی کی داد دینا پڑتی ہے۔ ایک انشائیہ نگار کا وصفِ خاص بھی یہی ہے کہ وہ اشیاء اور مظاہر کے بطون میں چھپے ہوئے پوشیدہ گوشوں کو اس خوبی سے آشکار کرے کہ قاری عش عش کر اٹھے۔ عبدالقیوم کا ذہن کائنات اور مظاہرِ فطرت کے بارے میں ہمہ وقت سوچتا رہتا ہے۔ ان کے ذہن میں جب کوئی نیا اور اچھوتا خیال یا پہلو آتا ہے تو ان پر مستی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اسے صفحۂ قرطاس پر لا کر قاری کو بھی اس سرشاری میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔ موت ایک ایسی سچائی ہے جس کا کوئی منکر نہیں ہے۔ موت کا کام انسان کو ہست و بود سے نابود کرنا ہے۔ اس دنیا میں کل جو لوگ تھے آج نہیں ہیں۔ آج جو ہیں کل نہیں ہوں گے۔ یہ سلسلہ ازل سے چل رہا ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ یہ درست ہے کہ موت سے کسی کو بھی رستگاری نہیں ہے۔ مگر جو لوگ اعلیٰ پائے کے فن پارے تخلیق کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں موت ان کے بدن کو چھوتی تو ضرور ہے مگر انہیں حیات ابدی سے محروم نہیں کر سکتی۔ اپنی تخلیقات کی وجہ سے وہ اپنا نام لوحِ جہاں پر انمٹ سیاہی سے لکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں عبدالقیوم اپنے انشائیے زندگی اور موت میں رقم طراز ہیں۔

''اگر لکھاری آتی جاتی سانسوں کے دوران جو کچھ بنتا ہے۔ وہ من و عن مشہور ادیب گورکی طرح جاندار اسلوب میں اور زندگی کی ہر کروٹ کو پوری سچائی

سے بیان کر دے تو پھر موت بھی اسے حیات ابدی سے محروم نہیں کر سکتی۔"

عبدالقیوم کے انشائیوں کے مجموعے "خیالی پلاؤ" کے مطالعہ کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت کا ذاتی عکس ان کے انشائیوں میں در آیا ہے جس سے ان کی شخصیت کی مدھم سی تصویر بنائی جا سکتی ہے۔ اس تصویر کو اگر بغور دیکھا جائے تو ان کے بچپن اور جوانی کی دلچسپیاں اور مشاغل کا پتہ چل جاتا ہے۔ ملازمت کے دوران وہ کہاں کہاں رہے اور وہ زندگی میں کن کن کٹھن مراحل سے گزرے۔ ان کے انشائیوں میں ان کے ماضی کی ایک ہلکی سی جھلک موجود ہے۔ اس ضمن میں ان کے انشائیے "ڈائری"، "کنگھی کرنا"، "بھول جانا"، "یادیں" اور "سفید بال" دیکھے جا سکتے ہیں۔

انشائیہ اچھوتے اور نو بہ نو خیالات کا زائیدہ ہوتا ہے۔ جب کوئی انشائیہ نگار اچھوتے خیالات کے پرند کو خوبصورت لفظوں کے جال میں قید کر لیتا ہے تو صفحۂ قرطاس پر انشائیہ ابھر کر سامنے آ جاتا ہے کسی شے یا موضوع کے ان دیکھے اور اچھوتے پہلوؤں کو صحافتی زبان میں بیان کرنے سے انشائیہ عالم وجود میں تو آ جائے گا۔ مگر اس میں وہ تاثیر پیدا نہیں ہو سکے گی۔ جو انشائیے کا خاصا ہے۔ اسی طرح کسی عام اور عام سے فرسودہ خیال کو دیدہ زیب لباس پہنانے سے وہ تحریر اہل ذوق کی تسکین کا سامان تو فراہم کرے گی۔ مگر انشائیہ کہلانے کی حق دار نہیں ہوگی۔ انشائیہ میں خیال اور الفاظ بھی آپس میں اس طرح مربوط اور پیوست ہوتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ خیالات کو تجسیم کرنے کیلئے سوچ سوچ کر الفاظ نہیں لائے جاتے بلکہ خیال کی مناسبت سے الفاظ خود بخود کود کر قلم کی نوک پر آ جاتے ہیں۔ اور انشائیہ نگار کا کام خیالات کو لفظوں کا حسین جامہ پہنانا ہے۔ عبدالقیوم کے انشائیوں میں یہ تمام اوصاف موجود ہیں۔ ان کی سرسبز و شاداب فکر، بے تکلف اسلوب اور اپنے موضوع سے گہرا لگاؤ کی وجہ سے ان کے

انشائیے قاری کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔شور سائنسی ایجادات کی زائیدہ ہے۔جس نے انسان کو بے شمار سہولتیں اور آسائش دے کر اس سے ذہنی سکون کی دولت چھین لی ہے۔موجودہ دور کے انسان کو شور کے آکٹوپس نے جکڑا ہوا ہے۔انسان اس کی گرفت سے نکلنے کی جس قدر جدو جہد کرتا ہے۔اس کی گرفت اسی قدر مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔شور انسان کی بہت سی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیوں کو کمزور کر رہا ہے۔عبدالقیوم اپنے انشائیے ''شور'' میں اس کی اہمیت کو اس انداز سے اجاگر کرتے ہیں کہ ہمیں اس پر ناک بھوں چڑھانے کی بجائے اس کا احسان مند ہونا پڑتا ہے۔

''جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنے کیلئے گھر اور لباس کے علاوہ نان جویں کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔جب خلق خدا قحط روزگار، عدم فراہمی دانہ گندم اور قوت خرید کی بے چارگی سے دو چار ہوتی ہے۔تو ملک بھرم میں وہ شور مچاتا ہے۔کہ اونچی اونچی کرسیاں تک ڈولنے لگتی ہیں۔یہ ''شور'' کا مثبت پہلو ہے اسے جمہوری شور بھی کہا جا سکتا ہے۔''

عبدالقیوم نے انشائیے کے مزاج کو سمجھا اور برتا ہے۔وہ طنز و مزاح بھی لکھتے ہیں ان کے انشائیوں کی کتاب خیالی پلائی اور طنز و مزاح کی کتاب پیچ و تاب فروری 2006ء میں اکٹھی اشاعت پذیر ہوئیں۔مگر جب وہ انشائیہ لکھتے ہیں۔تو اپنے اندر کے مزاح نگار کو اس میں مداخلت کی قطعاً اجازت نہیں دیتے۔وہ اس بات سے باخبر ہیں کہ انشائیے کا منصب ہنسی کے ذریعے اصلاح احوال ہرگز نہیں ہے۔اور اس کا کام صرف ذہنی آسودگی فراہم کرنا بھی نہیں ہے۔مزاح انشائیے کیلئے شجر ممنوعہ تو نہیں ہے۔مگر انشائیے میں اسے اتنی ہی مقدار میں شامل کیا جائے جتنی کہ انشائیے کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح نمک کھانے کو خوش ذائقہ اور لذیذ بناتا ہے۔اسے کھانے میں مقدار سے زیادہ

ڈال دیا جائے تو نہ صرف کھانے کی لذت ختم ہو جائے گی۔ بلکہ اسے حلق سے نیچے اتارنا بھی دشوار ہو جائے گا۔ اسی طرح انشائیہ مزاح کو ایک حد تک تو خوش دلی سے قبول کرتا ہے۔ مگر جب مزاح اپنی حدود سے تجاوز کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ انشائیے کے مزاج پر گراں گزرتا ہے۔ اور بعض اوقات تو اسے طنزیہ اور مزاحیہ مضمون بنا دیتا ہے۔ انشائیہ نگار فکر و فلسفہ کی متانت اور سنجیدگی کو شگفتگی اور لطافت کا حسین لباس پہنا کر اسے قابل مطالعہ بناتا ہے۔ طنز و مزاح کے شوخ رنگوں کا بھڑکیلا لباس اس کے جسم پر کسی طور پر خوش نہیں آتا۔ عبدالقیوم نے مزاح نگار ہونے کے باوصف انشائیے تحریر کئے رہیں وہ اپنے انشائیوں میں مزاح کی اتنی ہی مقدار شامل کرتے ہیں جتنی کی اسے ضرورت ہوتی ہے مزاح نگار ہونے کے باوجود ان کے انشائیے ''سفید بال'' کا یہ اقتباس دیکھئے۔

''لیکن اب تو سفید ریش ہانپتے کانپتے بس، گاڑی میں کھڑے جھولتے نظر آتے ہیں اور کوئی دھیان نہیں دیتا۔ پہلے سفید بالوں کے جتنے فوائد تھے۔ وہ اب قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔ اس لئے آج تقریباً ہر بزرگ خضاب یا ہیئر کلر کا محتاج بن چکا ہے۔ جو معاشرے کا طرۂ امتیاز تھا۔''

عبدالقیوم انشائیے کے میدان میں ایک مقام پر رکے نہیں بلکہ گزشتہ پندرہ سالوں سے وہ مسلسل مسافت میں ہیں۔ ان کے مزاج میں جو بے قراری اور اضطراب ہے وہ انہیں ایک جگہ ٹھہرنے نہیں دیتا بلکہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرم عمل رکھتا ہے۔ ان کے انشائیوں کی کتاب ''خیال پلاؤ'' اردو انشائیہ نگاری میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ امید ہے کہ وہ پہلے کے سے تسلسل سے اپنا تخلیقی عمل جاری رکھیں گے اور چند برسوں بعد اپنے انشائیوں کا دوسرا مجموعہ اردو ادب کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں گے۔

............☆☆............

”غزلیات جعفر طاہر“......ایک کتاب

پرانی تراکیب کو نئے انداز سے استعمال کرنے اور نئے الفاظ کی اختراع سے اردو زبان کو وسعت دینے، نئے محاورات تخلیق کرنے اور نئی علامتیں وضع کرنے والے منفرد لہجے کے با کمال اور قادر الکلام شاعر جعفر طاہر کی شخصیت اور فن پر وقت کی مکڑی نے جالے سے بن دیئے تھے اور خاصی گردان سے لپٹ گئی تھی۔ اس لئے نیاز مانہ پوری طرح ان کی طرف متوجہ نہ تھا۔ اتنی بڑی شخصیت کو اتنی جلدی فراموشی کے گڑھے میں دھکیل دینا انصاف پر مبنی نہیں ہے۔

ان جالوں اور گرد کو ہٹانے کا پہلا قدم منظور سیال نے 2005ء میں ان کی شخصیت اور فن پر ”شاعر نہیں ساحر تھا وہ“ کتاب مرتب کر کے اٹھایا تھا۔ اس کتاب میں پندرہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین شامل ہیں۔ علاوہ ازیں جعفر طاہر کی چند نظمیں، غزلیں اور کچھ کنیٹوز بھی موجود ہیں منظور سیال کی اس کاوش سے لوگ کسی حد تک ان کی شاعرانہ عظمت سے آشنا ہوئے۔

جعفر طاہر کی شخصیت اور فن کو گہری کھائی سے باہر نکالنے کا دوسرا قدم پروفیسر سلیم تقی نے اٹھایا، انہوں نے مختلف رسائل میں بکھری ہوئی جعفر طاہر کی 87 غزلوں کو جمع کر کے ”غزلیات جعفر طاہر“ کے عنوان سے حال ہی میں ایک کتاب شائع کی ہے 31

برس کی مدت کی غزلوں کو رسائل سے اکٹھا کرنا خاصا دِقت طلب کام ہے۔ چنانچہ پانچ سال کی تلاش کے بعد وہ یہ غزلیں جمع کر پائے۔ اس سلسلے میں انہیں اپنے دوستوں کا بھرپور تعاون بھی حاصل رہا ہے۔

اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ سلیم تقی نے غزلیں جمع کرنے ہی میں احتیاط نہیں برتی بلکہ جعفر طاہر کے حالات تحریر کرتے ہوئے بھی بہت محتاط رہے ہیں اور بنیادی ماخذ تک پہنچنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے جعفر طاہر کے قریبی قرابت داروں اور دوستوں سے بھی رابطے کیے، کتب اور رسائل سے بھی بھرپور استفادہ کیا ہے۔ جعفر طاہر کی غزلیات کی تدوین کا محرک 2004ء میں جھنگ میں ہونے والا وہ سروے بنا جس میں مجید امجد جیسے بڑے نظم گو کو دوسرے درجے کا شاعر قرار دیا گیا اور کیپٹن جعفر طاہر جیسے قادر الکلام شاعر کا نام سروے میں شامل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اس کتاب میں سلیم تقی شاہ نے محاورات، تراکیب، فرہنگ اور مرادی معنی کے ساتھ کلام کا فنی تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔

یہ بات باعث اطمینان اور انبساط ہے کہ جعفر طاہر کی شخصیت اور فن پر پڑی ہوئی گرد کی جس تہ کو وقت کا بہتا ہوا دریا روز بروز موٹی کرتا جا رہا تھا۔ اس کو ہٹانے کی جو ابتداء منظور سیال نے کی تھی۔ پروفیسر سلیم تقی نے "غزلیاتِ جعفر طاہر" سے گرد کو مزید ہٹانے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ امید واثق ہے کہ اب دوسرے نقاد بھی اس طرف توجہ دیں گے۔ اور اپنے قلم کے ذریعے اس رہی سہی دھول کو بھی ہٹا دیں گے۔ پھر جعفر طاہر کی شخصیت اور فن کے سارے نقوش چم چم کرنے لگیں گے۔

اس کتاب کا مقدمہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں جعفر طاہر کے فن کو نہایت عمدگی سے ہائی لائٹ کیا گیا ہے۔ جعفر طاہر کے کینٹوز اور نظموں کا تعارف نہایت

مختصر طور پر کرایا گیا ہے۔ دراصل سلیم تقی کا اصل موضوع جعفر طاہر کی غزلیات ہے۔ چنانچہ پوری توجہ غزل پر دی گئی ہے اور اس کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ سلیم تقی مقدمے میں لکھتے ہیں کہ جعفر طاہر کی غزل مرکزی ادبی روایت کی توسیع ہے۔ جعفر طاہر کا انداز فکر اور لب ولہجہ اس انفرادیت کا عکاس ہے جو ان ہی سے مخصوص ہے۔ سلیم تقی نے اپنے مقدمے میں درج کیا ہے کہ جعفر طاہر کے یہاں معنوی اور موضوعاتی جدت کی نسبت لسانی جدت زیادہ کارفرما ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مقدمے میں جعفر طاہر کی غزل میں استعمال ہونے والی تراکیب، محاورات، استعارات، تشبیہات، موسیقت اور غنائیت کے حوالوں سے ان کو ایک منفرد اور فعال تخلیق کار ثابت کیا ہے۔ بلاشبہ جعفر طاہر کو زبان پر کامل عبور حاصل تھا۔ قدرت نے انہیں بلا کا حافظہ عطا کیا تھا۔ الفاظ اور تراکیب ان کے سامنے عہد عتیق کے بادشاہوں کی کنیزوں کی طرح دست بستہ قطار اندر قطار کھڑی رہتی تھیں۔ لفظوں کے بے تاج بادشاہ ہونے کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کی یہ سطور ملاحظہ کیجئے۔

> ''ہم جب مصرعوں، شعروں اور بندوں پر بحثیں کرتے تھے تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا کہ جعفر طاہر کے ذہن میں مترادفات کے دریا بند ہیں۔ اگر ہم کسی ایک لفظ کے بارے میں طے کر لیتے تھے کہ مناسب نہیں ہے تو جعفر طاہر آن کی آن میں متبادل ہندی، فارسی اور عربی الفاظ کی قطاریں لگا دیتا تھا''۔

عشق و محبت کے مضمون پر اردو غزل کے قدیم و جدید تمام چھوٹے بڑے شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ یہ موضوع اردو غزل کی عمارت کا وہ بڑا اور مضبوط ستون ہے جس پر یہ عمارت کھڑی ہے۔ اگر اسے نکال دیا جائے تو باقی ستون اس عمارت کا بار برداشت نہیں کر پائیں گے۔ چنانچہ اس مضمون کو جعفر طاہر کی غزل میں بھی نمایاں مقام

حاصل ہے مگر ان کا انداز بیان اور خیال دوسرے شعراء سے منفرد ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز یہ نہیں کہ انہوں نے کلاسیکل روایت سے اپنا ناتہ توڑ کر غزل کہی ہے۔ ان کی غزل میں اسلوب اور موضوع دونوں سطح پر کلاسیکل اور جدید روایت شانے سے شانہ ملائے کھڑی ہیں۔

دونوں میں گونجتی ہیں بہاروں کی دھڑکنیں
میری غزل ہوئی کہ تمہارا بدن ہوا

جبیں جبیں پہ یہ پر پیچ کا کلوں کے ہجوم
یہ اڑ کے پہنچی ہیں چشموں پہ ناگنیں کیا کیا

حسن ممنونِ غازہ کیا ہوگا
رنگ چڑھتا نہیں ہے پارے پر

آنکھ پُر خون، بدن برق، رسیلی باتیں
اور کیا ہوتی ہے قاتل کی نشانی یارو

جو آگ طور پہ جلتی ہے کہ کیا کریں لے کر
وہ آگ اور ہے جو آپ کے بدن کی ہے

محولا بالا اشعار میں جذبے اور خیال کو جس حسین طریق سے الفاظ کا پیرہن پہنایا گیا ہے اس سے حسن و عشق جیسا پا افتادہ مضمون جو صدیوں سے اردو غزل کے بدن میں لہو بن کر دوڑ رہا ہے ایک نئے رنگ ڈھنگ اور ترنگ سے جلوہ ریز ہوتا ہے۔ پرانے خیال کو نیا انداز دینے اور پرانے الفاظ کو نئے معنی پہنانے کی وجہ سے ان کی غزل کلاسیکل روایت کے قلعے سے نکل کر جدت کے محل میں داخل ہو جاتی ہے۔

حسن نو خیز اور شباب حسن کے قصیدے تو اردو غزل کی ابتدا ہی سے پڑھے جا

رہے ہیں۔ مگر مرجھائے اور ڈھلتے ہوئے حسن کی طرف نظر جانے والے شعراء کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ جعفر طاہر جہاں حسن بلاخیز سے متاثر ہو کر شعر کہتے ہیں وہاں انہوں نے ڈھلتے ہوئے حسن (جس کی تمام کشش اور رعنائی وقت کی جونکیں تیزی سے چوس رہی ہوتی ہیں) کے قصیدے بھی لکھے ہیں۔

اس ڈھلتے ہوئے حسن کے لکھتا ہوں قصیدے
گرتی ہوئی دیوارِ حرم تھام رہا ہوں
گیت اس ڈھلتے ہوئے حسن پہ کیا کیا نہ کہے
بارہا ڈوبتے سورج کو ابھارا ہم نے
مرجھا کے بھی گئی نہ مہک جسم ناز کی
یہ موتیے کے پھول کوئی کاغذی نہ تھے

جعفر طاہر ایک بلند حوصلہ اور قناعت پسند شخص تھے۔ وہ زندگی کی تلخیوں سے نظریں چرانے اور ادبار کے آگے سر جھکانے کی بجائے دکھوں کے ساتھ زندگی گزارنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ مصائب میں بھی مسرت کے پہلو تلاش کر لیتے تھے۔ اس لئے ان کی غزل میں رجائیت کا پہلو بہت نمایاں ہے جو انہیں انفرادیت کی مسند پر متمکن کرتا ہے۔

دوزخ میں بھی آنے لگیں جنت کی ہوائیں
یارب تری رحمت کا بیاں ہو نہیں سکتا
غبارِ دشت سے نکلے گا کارواں طاہر
مری غزل کو آوازۂ جرس جانو
نہ زرو مال نہ عالی نسبی کچھ بھی نہیں
ہاں سرِ لوحِ جہاں مرا نام تو ہے
لب و نگاہ پہ مہریں لگی رہیں طاہر
کسی کا زور نہ لیکن میرے قلم پہ چلا

جعفر طاہر نے غزل کو جہاں حسن و عشق، تصوف، غمِ دُنیا، بے ثباتی، اخلاق و تہذیب اور فطرت پسندی ایسے مضامین سے مزین کیا ہے وہاں اپنے ذاتی دکھوں کو بھی نہایت عمدگی سے غزل کے روپ میں ڈھالا ہے۔ سلیم تقی ان کی زندگی کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

''جعفر طاہر کے ایک بھائی سید باقر علی شاہ (جو پنجاب پولیس میں سب انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے) خاندانی دشمنی کی بھینٹ چڑھے۔ چھوٹے بھائی کی بے وقت وفات کی داخلی شہادت جعفر طاہر کے اس شعر میں موجود ہے۔

پھر گئی آنکھوں میں طاہر نوجواں بھائی کی لاش
جب سنا میں نے کہیں اک بے خطا مارا گیا

جعفر طاہر نے اپنے ذاتی دکھوں کو اس مہارت سے غزل کی زینت بنایا ہے کہ وہ ذاتی سطح سے بلند ہو کر اجتماعیت کے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں اور طبقاتی سطح تک محدود رہنے کی بجائے پوری انسانیت کا درد بن کر لو دینے لگتے ہیں۔

میری غریب بیٹی نے دیکھا تھا خواب اور
اتری جو میرے گھر میں وہ بارات اور تھی
بوٹ لینے کی تو کب طاہر ہمیں توفیق تھی
اب تو سب کا منہ چڑاتی ہیں جرابیں کیا کہوں
انصاف کی یہ آنکھ، یہ سورج کی روشنی
یارب یہی ہے دن تو مجھے رات چاہئے

وہ آزار میں بھی ایک قسم کی لذت محسوس کرتے ہیں۔ زندگی کو قدرت کا ایک بہت بڑا انعام سمجھتے ہیں۔ چنانچہ خود کو غم کے عفریت کے حوالے کرنے کی بجائے اس سے امرت کشید کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

زندگی کچھ بھی سہی پھر بھی بڑی دولت ہے
موت سی شے بھی یہاں جنسِ گراں ہے کہ نہیں

جعفر طاہر کو اپنی علمی حیثیت اور شاعرانہ قامت کا پورا پورا احساس تھا اور اس احساس میں تعلّی کا عنصر بھی شامل تھا۔ بعض اوقات اپنی مدحت طرازی میں اتنے آگے نکل جاتے تھے کہ انہیں اپنے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اپنی علمی قوت کا برملا اظہار اور تخلیقی صلاحیتوں کے فی البدیہ مظاہرہ کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ بلاشبہ وہ لفظوں کے بے تاج بادشاہ تھے۔ لفظ کی حرمت اور اس کے برمحل استعمال پر قادر تھے۔ جس کا اظہار ان کی غزلوں میں بھی موجود ہے۔

طاہر طلسمِ ہوش رُبا ہے تری غزل
شاید بتوں کو ایسے فسوں گر عزیز ہیں

وہ جنوں پیشہ جواں تو نہیں جعفر طاہر
جس کے اندازِ سخن کا نہیں ثانی یارو

ہر سخن ور ہمیں پہچانتا ہے جانتا ہے
صاحب سلطنتِ لوح وقلم اور سہی

طاہر سیاہ فام ہوئے ہم تو غم نہیں
روشن ہمارے نام سے نامِ سخن ہوا

نہ زرو مال نہ عالی نسبی کچھ بھی نہیں
ہاں سرِ لوحِ جہاں نقش مرا نام تو ہے

میر وغالب کی طرح جعفر طاہر کو بھی اپنے عہد کے لوگوں سے یہ شکایت رہی ہے کہ ان کے فن کی جو قدر ہونی چاہئے تھی وہ نہیں ہوئی۔ اس کی کئی وجوہ ہوسکتی ہیں۔ اوّل یہ کہ ان کے فن میں جو گہرائی، گیرائی اور پہلوداری ہے لوگ اس کی تفہیم پوری طرح نہیں کر

پائے۔اس لئے انہیں وہ پذیرائی نہ مل سکی جس کے وہ حقدار تھے۔دوم ان کے معاصرین ان کے کلام سے خوف زدہ تھے۔تفہیم کے باوجودان کے ساتھ برادرانِ یوسف کا سا سلوک روا رکھتے تھے۔ جب وہ دیکھتے تھے کہ ان سے کم درجے کے شعراء اقتدار یا دولت کی وجہ سے ان سے زیادہ شہرت اور پذیرائی حاصل کررہے ہیں تو یہ بات انہیں ذہنی اذیت میں مبتلا کردیتی تھی اوران کے نوکِ قلم سے اس قسم کے اشعار وارد ہونے لگتے تھے۔

حیرتِ اہلِ نظر، اہلِ ہنر ہے کہ جو تھی
شہرۂ کم نظراں، بے ہنراں ہے کہ جو تھا
ان دشمنانِ شعروسخن سے کہوں تو کیا
یوسف ہوں میں اور مجھ کو برادر عزیز ہیں
ہم جن کی نذر کرتے جواہر کلام کے
طاہر ہمارے شہر میں وہ جوہری نہ تھے

جعفر طاہر کے کلام میں جہاں تعلّی کا عنصر موجود ہے وہاں عاجزی اور انکساری بھی ان کی شاعری کا جزو ہے۔نیچے آنے والے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ باکمال شاعر ہونے کے باوجود بھی انہیں اپنے علم وفن پر کوئی زعم تھا اور نہ ہی خاندان کی عالی نسبی پر کوئی فخر۔ان کی شاعری کا یہ تضاد قاری کو الجھن میں ڈال دیتا ہے۔کہ ایک طرف تو وہ اپنی شاعری کو طلسم ہوش ربا کہتے ہیں اور اپنے اندازِ سخن کا کسی کو بھی ثانی نہیں سمجھتے اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ ہم تو کسی کمال کے بھی مدعی نہ تھے۔میرے خیال میں جب وہ اپنے فن کی ناقدری اور بے توقیری دیکھتے تھے تو جوش میں آکر اپنی تعریف وتوصیف کرنے لگتے تھے۔جب جوش کا طوفان گزر جاتا ہے اور نارمل ہوجاتے تو انہیں احساس ہوتا ہے کہ علم وفن کی تو کوئی انتہا نہیں ہوتی۔اس میدان میں وہی لوگ اپنے نام کا پرچم سربلند کرسکتے ہیں جو خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں۔اپنے آپ کو اکمل سمجھنے والے لوگ اس پانی کی مانند ہوتے ہیں جو زیادہ عرصہ

ایک جگہ ٹھہراؤ کی وجہ سے تعفن زدہ ہو جاتا ہے۔ جعفر طاہر کے کلام میں بہتے ہوئے پانی کی سی تازگی و شادابی جدت و ندرت، گہرائی اور گیرائی موجود ہے۔ کلام میں یہ خوبیاں خوب سے خوب تر کی خواہش کی وجہ ہی سے پیدا ہوئی ہیں۔

طاہر ہم اہلِ دل کے دل و جاں سے ہیں غلام
زعمِ ہنر نہ فخر ہمیں خاندان پر
پامال کر دیا جو فلک نے تو کیا کہیں
ہم تو کسی کمال کے بھی مدعی نہ تھے

پروفیسر سلیم تقی کی اس خوبصورت کاوش کی وجہ سے میں جعفر طاہر کی غزلوں پر مضمون مرقوم کرنے کے قابل ہوا ہوں۔ اگر مجھے یہ سہولت میسر نہ آتی تو یہ مضمون بھی صفحۂ قرطاس پر نمودار نہ ہوتا۔ میں ان کے اس کارنامے پر انہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ جعفر طاہر کی شدید خواہش تھی کہ رسائل و جرائد میں بکھری ہوئی غزلوں کو یکجا کر کے خوبصورت کاغذی پیرہن پہنایا جائے۔ وہ اپنی خواہش کا اظہار اپنے قریبی دوستوں سے بھی کرتے تھے مگر افسوس ان کی اس خواہش کی طرف کسی نے بھی توجہ نہ دی اور بالآخر انہوں نے 26 مئی 1977ء کو بارِ زیست اتار پھینکا۔ ان کی وفات کے 31 سال بعد پروفیسر سلیم تقی نے ان کی خواہش کی تکمیل کر دی۔ امید واثق ہے کہ جعفر طاہر کی غزلیں ناقدین کی توجہ کا مرکز بن کر ان کی وہ پیش گوئی جو انہوں نے اپنے فن کے بارے میں اس شعر میں کی تھی انشاء اللہ جلد پوری ہو جائے گی۔

مٹ جائے مرا نام و نشاں ہو نہیں سکتا
یہ ظلم سرِ لوحِ جہاں ہو نہیں سکتا

............☆☆............

''منظر خواب دریچے''......اور صائمہ نورین

صائمہ نورین بخاری وہ خوش بخت ادیبہ ہیں جن کے خاندان میں اردو ادب ایک طویل عرصے سے چلا آ رہا ہے۔ان کے بزرگوں میں اردو کے صاحب طرز ادیب خواجہ حسن نظامی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ان کے دادا سید قاسم دہلوی شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔وہ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھے۔ان کی امی اور ابو سید ناظم علی کو بھی اردو ادب سے گہرا لگاؤ ہے۔صائمہ نورین بخاری نے جب آنکھ کھولی تو ادب کی دیوی کو پہلے ہی اپنے گھر میں موجود پایا اس ادبی ماحول کا اثر ہے کہ انہوں نے اپنا ادبی سفر صرف گیارہ برس کی چھوٹی عمر میں بچوں کی دنیا ''امروز'' کے ساتھ کیا تھا۔جبکہ اس عمر میں عام بچے ''صبح کی سیر'' اور ''میرا پسندیدہ استاد'' جیسے مضامین بھی رٹا لگا کر لکھتے ہیں۔

معاشیات میں ماسٹر ڈگری حاصل کرنے کے بعد ان کی طبیعت کی جولانی اور قلم کی روانی میں تیزی آئی۔اور وہ جلد ہی ملک کے نقادوں کی توجہ اپنی افسانہ نگاری کی طرف مبذول کروانے میں کامیاب ہوگئیں۔صائمہ نورین بخاری صرف افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ شاعرہ بھی ہیں۔ان کے افسانے اور کلام ملک کے معروف رسائل و جرائد کی زینت بنتے رہتے ہیں۔میں اس مضمون میں صرف ان کی افسانہ نگاری کو ہائی لائٹ کرنے کی کوشش کروں گا۔ان کی شاعری پر اس وقت قلم اٹھاؤں گا۔جب ان کا پہلا

شعری مجموعہ صفحۂ قرطاس پر جلوہ افروز ہوگا۔ صائمہ نورین کا افسانوی مجموعہ ''منظر خواب دریچے'' آج کل میرے زیرِ مطالعہ ہے۔ اس مجموعے کے تمام افسانے میں نے لوڈ شیڈنگ کے دوران پڑھے ہیں۔ جب بجلی اچانک غائب ہو جاتی ہے اور اپنے پیچھے حبس اور گھٹن زدہ ماحول چھوڑ جاتی ہے تو میرا ہاتھ کسی خودکار نظام کے تحت حرکت میں آتا ہے اور میز پر پڑے ''منظر خواب دریچے'' کی طرف بڑھ جاتا ہے اور میں کسی افسانے کی قرأت میں محو ہو جاتا ہوں۔ افسانے میں پیش کیے گئے واقعات اور مناظر کے تانے بانے، کرداروں کو حاصل ہونے والی مسرتوں اور مصیبتوں، زبان و بیاں کی خوبصورتی مجھے اس حبس زدہ ماحول کے احساس کے حصار سے باہر نکال دیتی ہے۔ اور مجھے بجلی کے جانے کا زیادہ احساس نہیں ہوتا۔ جب میں افسانے کی دلکش فضا سے باہر آتا ہوں تو عموماً بجلی میرے استقبال کے لیے موجود ہوتی ہے۔

صائمہ نورین بخاری کے افسانوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے افسانوں کا مواد اپنے اردگرد پھیلے متوسط طبقہ کے ان چھوٹے چھوٹے المیوں سے حاصل کرتی ہیں جنہوں نے اس متوسطہ طبقے کے لوگوں کو اکٹوپس کی طرح جکڑا ہوا ہے۔ وہ ان سے نجات حاصل کرنے کی تگ و تاز میں مصروف ہیں۔ مگر ان کی گرفت سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ صائمہ نورین کو ان لوگوں سے لگاؤ بھی ہے اور ہمدردی بھی ان لوگوں کے جذبات فطری اور نیچرل ہیں۔ ان کی محبت، مامتا، ایثار و قربانی میں کوئی تصنع و بناوٹ نہیں۔ لوگوں کے جذبات فطری اور نیچرل ہیں۔ صائمہ نے ان لوگوں کے تلخ حقائق کو بہت عمدہ اور خوبصورت روپ دے کر سوچ کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ افسانہ ''ساون کی پہلی بارش'' کا یہ اقتباس دیکھیے جس میں سفید پوش طبقہ کے ایک گھر کے مسائل چند سطور میں بہت خوبی سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس گھرانے کی معیشت کی مکمل

تصویر ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

"آخر ماں بیچاری بھی کیا کرتیں۔ ساجد کی فیس، فائزہ کے کالج کے خرچے بجلی کا بل، سوئی گیس کا بل، گھر کا سودا سلف اور کبھی ختم نہ ہونے والی چھوٹی چھوٹی تمناؤں کا ایک لامتناہی سلسلہ سب کے سب مہینے کی پہلے تاریخ کے انتظار میں رہتے تھے اور آج گھر کی واحد کماؤ پوت ثمینہ کے لیے ساون کی پہلی بارش اور مہینے کی یکم اکٹھی آ گئی تھی۔"

اس افسانے کا اختتام نہایت دردانگیز ہے۔ واپسی پر ثمینہ کا پھولا ہوا پرس جس میں اس کی سہیلی نازیہ کے قیمتی بندے تھے "جو اس نے اپنی چھوٹی بہن کی خوشی کے لئے اس سے مستعار لئے تھے" اور اس مہینے بھر کی تنخواہ بھی۔ اس موقع پر ثمینہ کی پرس پر گرفت مضبوط فطری عمل تھا۔ مگر اس کی تمام تر احتیاط کے باوجود کسی امیر گھرانے کا بگڑا ہوا خوبصورت نوجوان تھا جو اس کے سوئے خوابوں کو جگا کر اس کے ہاتھ سے پرس چھین کر رفو چکر ہو جاتا ہے۔ اور سڑک پر گری ہوئی ثمینہ کے پیچھے مسائل و مصائب کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چھوڑ دیتا ہے"۔

ایک خاتون ہونے کے ناطے صائمہ نورین بخاری عورتوں کے المیے کو ابھارنے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں کے اکثر مرد فعال ہیں اور ان کی فعالیت کے مظالم سہنے کے باوجود اس کا ساتھ دینے کے لئے مجبور ہوتی ہے۔ وہ مرد کے تیر ستم کا نشانہ بننے کے باوجود خاموش رہتی ہے۔ مگر ظلم حد سے گزر جاتا ہے تو یہ ناتواں اور کمزور عورت ایک ایسے بھونچال کا روپ اختیار کر لیتی ہے جو مرد کی خود پسندی کی مضبوط حویلی کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیتا ہے عورت پر حکم چلانے، اپنی منوانے اور ظلم ڈھانے والا مرد وحشی درندے کی طرح دہاڑنے لگتا ہے مگر اس کی دہاڑ میں شکست خوردگی کا عنصر نمایاں

ہوتا ہے افسانہ ''من کا سودا'' کے یہ چند مکالمے ملاحظہ کیجئے:

''بکواس بند کرو...... انعم...... زبان بند کرو'' اظفر حیات نے الماری سے پستول نکالا...... ایک جھٹکے سے بند دروازہ کھولا...... چیختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا...... اماں سن لیا آپ نے ...... زبان درازی کی انتہا دیکھ لی آپ نے۔''...... ملا دی اس نے ہماری حویلی کی عزت خاک میں ...... وہ جا رہی ہے اماں...... روک لیں اسے اور انجام بھی سمجھا دیں۔'' وہ پستول لہراتا ہوا بولا مگر اماں خاموش رہیں'' وہ اگر گھر سے باہر نکلی تو میری بڑی ذلت ہوگی اماں...... بڑی ذلت ہوگی۔'' وہ تحکمانہ انداز میں ماں کو خدشہ بتانے لگا مگر اماں خاموش رہیں''۔

صائمہ نورین نے عورت کے آلام و ادبار کو مختلف زاویوں سے ہائی لائٹ کیا ہے۔ مشرقی عورت تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود معاشرتی اقدار کی وجہ سے اپنے بزرگوں کے کئے ہوئے فیصلے کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہوتی ہے۔ (چاہے وہ فیصلہ غلط ہی کیوں نہ ہو) اس مجموعے میں شامل ''ندائے سحر'' ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس میں ایک تخلیق کار لڑکی کو جس کی تحریروں میں جاذبیت بھی ہے اور چاشنی بھی، گہرائی بھی ہے اور شعریت بھی۔ وہ حسین و جمیل اور ذہین لڑکی اپنی سوتیلی ماں کی بھینٹ چڑھ کر ایک ایسے خاندان میں بیاہی جاتی ہے جس کا مکان ہی تنگ نہیں ہوتا بلکہ ناخواندہ مکینوں کے ذہن مکان سے بھی زیادہ تنگ و تاریک ہوتے ہیں۔ وہ صبر و تحمل کی پیکر لڑکی ان نامساعد حالات میں بھی زندگی بسر کرنے کا جواز تلاش کر لیتی ہے۔ افسانے کے اختتام پر مجید امجد کا یہ شعر میرے حافظے کی البم سے نکل کر سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

دوست یہ سب سچ ہے لیکن زندگی
کاٹنی تو ہے بسر کرنی تو ہے

''اس صابر و شاکر خاتون کے مکالمے دیکھئے کہ وہ کس انداز سے اس

ناخوشگوار ماحول سے سمجھوتہ کرتی ہے۔اس نے اپنے ننھے منے بچوں کو اپنے
پاس اپنے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے بہت جذباتی انداز میں کہا ''تہمینہ مجھے
اب کسی پناہ گاہ کی کوئی تلاش نہیں کیونکہ میں اب خود سائبان ہوں میری
چھاؤں ان کے لیے ہے۔ میں اب مستقبل سے نہیں ڈرتی صرف حال سے
ڈرتی ہوں لیکن پھر بھی خوش ہوں۔''

صائمہ نورین کے افسانوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے اکثر افسانوں کی
شروعات منظر نگاری سے کرتی ہیں۔اور وہ جس منظر کو دیکھتی ہیں اسے الفاظ کے ذریعے
اس طرح پیش کرتی ہیں کہ اس کی اصل کیفیت آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ان کے
اسلوب میں اس قدر مٹھاس ہوتی ہے کہ قاری اس کی چاشنی میں چپک کر رہ جاتا ہے۔اور
افسانے کے اختتام تک اس کی محویت بدستور برقرار رہتی ہے۔افسانہ ''منزلیں تنہائی کی
'' کی ابتداء کتنے دل آویز انداز میں کرتی ہے۔

''باہر سورج ڈوب رہا تھا دھندلکوں میں لپٹی ہوئی شام سمندر کے وسیع
سینے میں اتر رہی تھی......ٹھاٹھیں مارتے سمندر کے قلب سے ایک لہر تیزی سے
اٹھی ہے......ساحل تک پہنچتی اور پھر ریشمی سرمئی چمک لئے واپس چلی جاتی
ہے۔سمندر پر جھکے آسمان پر کہیں کہیں ارغوانی اور سرمئی بادل اڑ رہے تھے''۔

صائمہ نورین کے افسانوں سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ ان کا خواب آگیں
ماحول کی رفعت پر پرواز کرنے والا طائرِ خیال زندگی اور حقیقت کے آدرش کو اپنی چونچ
میں لے کر اڑتا ہے یہی وجہ ہے وہ صورت حال کی کیفیت کو مختلف کرداروں کی حرکات اور
واقعات کے زیر و بم کے ذریعے اسی طرح پیش کرتی ہے کہ زندگی اپنی تمام تر رعنائی اور
زیبائی سمیٹ کر ہمارے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔''پیاس کی مسافت'' کی یہ سطور

ملاحظہ فرمائیے:

"انبساط خوشی و مسرت کی ان گنت ننھی منی کرنیں اس کے گرد پھیلنے لگیں وہ مسحور سا ہو گیا......لیکن اگلے ہی لمحے اس کے لگژری ٹریولنگ کوچ کو حادثہ پیش آچکا تھا......مادی دنیا کے چلتے پھرتے مادی پرزے جنھوں نے انسان کا احساس مروت کچل کرر کھ دیا۔ایک دوسرے کو روندتے ہوئے تباہ ہو چکے تھے۔"

صائمہ نورین بخاری کے افسانوں کی قرأت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان کے اندر ایک انشائیہ نگار بھی چھپا ہوا ہے۔ جو کبھی کبھی ان کے افسانوں میں اپنی جھلک دکھاتا ہے۔اس کی یہ جھلک کبھی دو ایک جملوں تک ہوتی ہے اور کبھی ایک پیرا گراف کی شکل میں......جس روز ان کی نظر اپنے اندر کے انشائیہ نگار پر پڑ گئی تو صفحہ قرطاس پر ایک انشائیہ چم چم کرنے لگے گا اور اس کے بعد انشائیوں کی تخلیق کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔
"منظر خوب دریچے" کا یہ پیرا گراف دیکھئے جس میں انشائیہ نگاری کے تیور عینک اور پہلی محبت کے اشتراک کے حوالے سے دکھائے گئے ہیں۔

"مجھے کبھی کبھی عینک اور پہلی محبت میں بہت سی علامات مشترک نظر آتی ہیں کہ دونوں اپنے اپنے ظہور میں آنے کے بعد ہمہ وقت آنکھوں پر چھائی رہتی ہیں۔"

"دماغ پر سوار رہتی ہیں دونوں کے بغیر زندگی بالکل پھیکی اور بے رنگ لگتی ہے دونوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں آنکھوں کے سامنے ہمہ وقت درد کے پانی میں ڈوبے رہتے ہیں۔ دونوں اگر ایک بار مقدر میں لکھے جائیں تو آنکھوں کو ٹھکانہ بنا کر تمام عمر ساتھ رہتی ہیں۔"

صائمہ نورین نچلے طبقے کی سائیکی کا بہت عمدگی سے (Analysis) کرتے

ہوئے ''منظر خواب دریچے'' میں لکھتی ہیں کہ مفلسی صرف حسِ لطافت کو ہی نہیں مٹا دیتی بلکہ انسان کو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم کر دیتی ہے اور وہ اچھے برے انسان کی تمیز نہیں کر پاتا۔ اس قسم کے لوگ ایک وقت کا کھانا کھا کر ہیروئن فروش اور سمگلروں کی حمایت پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اپنا قیمتی ووٹ بھی چاولوں کے چند نوالوں کی نذر نہیں کر دیتے ہیں۔ بلکہ ان کے حق میں نعرے بازی کرنے اور لڑنے جھگڑنے کے لیے بھی ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کی نادانی اور کمزوری سے بااثر مہرہ باز لوگ خوب فائدہ اٹھاتے ہیں اور انہیں اپنے مفاد کے لیے خوب استعمال کرتے ہیں۔ جب مقصد نکل جاتا ہے تو انہیں پہچاننے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔

''ہمارے لوگ بھی کیسے معصوم اور ناسمجھ ہیں بلکہ یوں کہیے کہ بھوک وافلاس نے ان کی عقل چھین لی ہے۔ جس نے چند دیگیں پکا کر چاولوں کا چوگا ڈال دیا یہ بے وقوف پرندے اسی کے نغمے الاپنے لگے۔ جس نے صحرا میں کھڑے ہو کر سبز باغ دکھا دیئے تو یہ ایسے ہپناٹائز ہوئے کہ انسان کی بجائے ربوٹ ہو گئے۔ انہوں نے جیسا کہا انہوں نے ویسا ہی کرنا اپنا نصب العین اور فرض سمجھ لیا۔''

..........☆☆..........

پروفیسر شفیع ہمدم یوں تو اپنی سرکاری ملازمت کے دوران میں بھی کُل وقتی طور پر اُردو ادب کے ساتھ وابستہ تھے۔ اُردو کی تدریس ان کا فرضِ منصبی تھا اور اس دور میں تخلیق کاری ان کے ذوق وشوق کی مظہر تھی۔ لیکن مضافات کا ایک ادیب ہونے کی وجہ سے بڑے شہروں کے ادباء ان کی طرف کم کم دیکھتے تھے۔ حتیٰ کہ انہیں جز وقتی ادیب شمار کرنے سے بھی گریز نہ کرتے۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد شفیع ہمدم نے اپنی مضافاتی حیثیت کو تو قائم رکھا لیکن اپنے ذوق وشوق کی آبیاری کے لئے ادب کو پورا وقت دینے لگے۔ اس کل وقتی ادیب کے جوہر کو سب سے پہلے ڈاکٹر وزیر آغا اور شاہد شہدائی نے پہچانا اور ان کی تخلیقات کو رسالہ ''اوراق'' اور ''کاغذی پیرہن'' میں نمایاں طور پر پیش کیا تو اہلِ نظر کو خوشی ہوئی کہ ''ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی''۔

شفیع ہمدم کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے تخلیقی اظہار کو کسی ایک صنف ادب تک محدود نہیں رکھا بلکہ شاعری، افسانہ، خاکہ اور انشائیہ کی اصناف میں اپنا مقام خود اپنے زورِ قلم سے بنایا اور اب ان کے اس مقام کو لاہور، اسلام آباد اور کراچی جیسے بڑے شہروں کے ادیبوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اس دوران وہ اپنے مطالعے کے ثمرات عملی تنقید کی صورت میں بھی پیش کرنے لگے۔ یہ نئی جہت جب مسلسل سامنے آنے لگی تو کئی ممتاز ادیبوں نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا کیوں کہ وہ ادب پارو ں کو فن کی نظریاتی سطح پر پڑھتے ہیں اور پھر اس کے داخلی جواہر کو کشادہ نظری سے سامنے لاتے اور مصنف کو ادب کی کہکشاں کا روشن ستارہ بنا دیتے ہیں۔ اپنے معاصرین سے شفیع ہمدم کا تنقیدی رویہ اعترافِ فن کا ہے لیکن جب وہ اپنے دور کے سینئر اور بزرگ ادیبوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کا خامۂ تنقید سرتاپا عقیدت بن جاتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے چراغ کی لو بزرگ ادیبوں کے تذکرے سے روشن کر رہے ہیں اور اپنا ذوقِ ادب سنوار رہے ہیں۔ دونوں صورتوں میں ان کا بنیادی مقصد صداقت کی تلاش وجستجو کے علاوہ اپنے جمالیاتی انبساط میں دوسروں کو شامل کرنا بھی ہوتا ہے۔ اس مقصد نے ان کی تنقید کو ایک خوبصورت مثبت جہت دے دی ہے۔ پروفیسر جمیل آذر کی زبان میں بات کرنے کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ شفیع ہمدم نے اس کتاب میں ''انشائی تنقید'' کے چند بامعنی اور خرد افروز مضامین پیش کر دیئے ہیں جو قاری کو اصل کتاب کی طرف راغب کر دیتے ہیں اور ان کی تنقید کو تخلیقی درجے پر لے آتے ہیں۔ مستقبل کے ادب کو ان سے بڑی توقعات ہیں۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

انور سدید

MAQBOOL ACADEMY
مقبول اکیڈمی، لاہور